پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱 0307-2128068
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️
مُقیم اثر بیاوَلی
بدن نژاد قبا

بسم الله الرحمن الرحيم
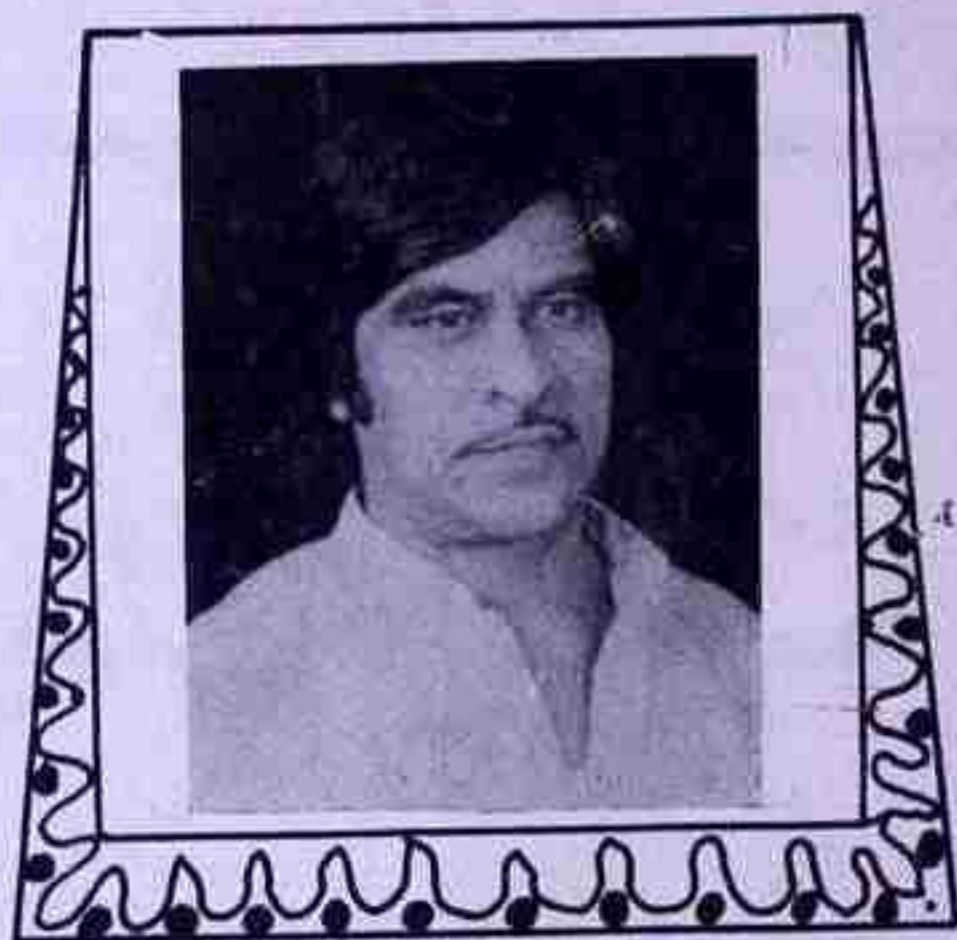
میں بدلتا ہوا سکہ ہوں نئی قدروں کا
وقت سا مجھ کو بھی کھو دو گے تو پچھتاؤ گے

مقیم اثر

توازن پبلیکیشنز ـــــ مالیگاؤں

زیرِ اہتمام :— توازن پبلیکیشنز مالیگاؤں
اشاعت :— ۱۹۹۴ء سنہ پہلی بار
تعداد :— پانچ سو (۵۰۰)
کتابت :— انصاری نہال احمد
ٹائیٹل :— احمد حنیف
طباعت :— لتا لی پرنٹرس، پونہ (بتوسط اسحٰق، پونہ)
قیمت :— ایک سو اکاون روپے
Rs. 151
ترتیب و تہذیب :— صابر زاہد جلگانوی

رابطہ
مقیم اثر بیاولی۔ ۲۶۱۔ ایم۔ ایچ۔ بی۔ کالونی
مالیگاؤں P. NO. 423203 (ناسک)

آنکھیں بھی چاہئیں نئی، پڑھنے کے واسطے
رکھ دے پرانی آنکھ کہ منظر نیا ہوں میں

فہرست

آزاد نظمیں

آزاد غزلیں

اِنتساب

تخلیقیت کے اُس ازلی، اَبدی و دَوامی چشمۂ بیکراں کے نام!
جو زمیں کی ویرانیوں کو رنگ و نُور کی قبائیں دے کر، سبز و سُرخ موسم کی مہکتی زبانوں سے اپنی حمد و ثنا سُنتا ہے۔

مُحتاجِ کرم
مُقیم اثر بیاولی

اَلحمدُ لِلّٰہ

سَاری تعریفیں اُس کے لئے
جس نے اک ذرّۂ خاک کو آسمانوں سے بالا کہا
مٹیوں کا سنبھالا کہا، اپنے دل کا اُجالا کہا
بے سُتوں آسمانوں کا معمار وہ
خاک پر رنگ، نُور اور خوشبو کا تابندہ اظہار وہ
چاند، سُورج، ستاروں میں اُس کی ضیاء
اُس نے ہی سیپیوں میں گہر ٹانک کر
بحر کو ناز کرنے کا موقع دیا
موسموں کا تغیّر وہی
جگمگاتی ہوئی فصل میں سوز و نم کا تصوّر وہی
وہ ازل وہ ابد، زندگی اور موت اُس کی مرضی عطا
جو بھی اُس سے جُڑا جاوداں ہوگیا
آگ میں گل کھلائے کبھی
آگ، پانی کے قطرے سے گل میں لگائے کبھی
خشک و تر اُس کی مژگاں کے صورت بدلتے ہوئے زاویئے
سیم بر اُس کے ہونٹوں کی مُسکان کے

رنگ میں ڈھلتے راحت فزا راستے
جانِ گوہر وہی، حُسنِ ذرّہ وہی
زخم کے راستے، سر دمٹّی کے تن میں مچلتی اُڑانوں کا دہکا اِشارہ وہی
اُس کے لب پر کِھلا ایک لفظ
کائناتوں کا مظہر بنے
اپنا محبوب جس کو کہے
دونوں عالم کا سردار بن کر جیے
حِکمتیں، عزّتیں، شہرتیں، ذلّتیں،
بادشاہت کے اونچے علَم
اُس کے آنگن کی اُڑتی ہوئی دھول سب
وہ زماں، وہ مکاں، لازماں، لامکاں
اُس کے آگے چلیں اُس کا پرچم اُٹھائے ہوئے
سرنگوں باادب روز و شب
وہ یقیں ہی یقیں
اِس جگہ مات کھا جاتے ہیں
اے گماں تیرے اب اور جب
ساری تعریفیں اُس کیلئے
جس نے اک ذرّۂ خاک کو
اپنے دل کا اُجالا کہا
آسمانوں سے بالا کہا
مٹیوں کا سنبھالا کہا

نعتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم

ہوتی ہے ریت سُرخ وہ دریا وہی تو ہیں
پیاسی رُتوں میں سبز کنارا وہی تو ہیں

ہر اضطراب آ کے یہیں مطمئن ہوا
جسموں کی آب، رُوح کا نغمہ وہی تو ہیں

اے ماہتاب اُن کا بہت احترام کر
دریا کی بھیگی پلکوں کا سپنا وہی تو ہیں

راتوں کو آفتاب کا ہمسر بنا گئے
سجدہ گزارِ عشق کا چشمہ وہی تو ہیں

پھولوں کا سینہ چاک ہے جن کے فراق میں
اے نکہتِ بہار وہ شعلہ وہی تو ہیں

خیرُ البشر بھی رحمتِ پروردگار بھی
جلتے سفر میں رُویتِ سبزہ وہیؐ تو ہیں

سُورج جو اپنی چھت کو زمیں پر اُتارے گا
ہم بے گھروں کا آخری تکیہ وہیؐ تو ہیں

ہے اُن کی معرفت ہی میں پنہاں وصالِ یار
آئینۂ جمال کا پردہ وہیؐ تو ہیں

بے جان پتھروں کے لبوں کی گواہیاں
رَبّ کی تجلّیوں کا سَراپا وہیؐ تو ہیں

آنکھ کے دریا میں آگے ضبط کی دیوار رکھ
اپنی پتواروں میں خود اپنے لہو کی دھار رکھ

برف کے رستے ہیں تیری سانس بھی جم جائیگی
جسم اندر جسم، روشن شعلۂ بیدار رکھ

سر پھرے گرداب میں ساحل اگر درکار ہے
اپنے ہی ہاتھوں میں اپنے درد کی پتوار رکھ

دار کی ویرانیوں کو دے سروں کا بانکپن
حسرتِ محراب و منبر اک طرف اک بار رکھ

آگ کی بستی اگر ہے بازوؤں کو آگ کر
آنکھ کے پیالوں میں لیکن ابرِ گوہر بار رکھ

زندگی سے کٹ کے جینا تو کوئی جینا نہیں
اپنے ہی ہونٹوں پہ اپنا سرمدی اظہار رکھ

بستیاں اپنائیں گی اک دن محبّت کو ضرور
رستہ رستہ گرم اپنے درد کا بازار رکھ

اِتّباعِ خواب سے ہم اور رُسوا ہو گئے
اب ہماری راہ میں تعبیرِ خوش آثار رکھ

سرکشی تھی ذات کی، یا بُغض تھا اقرار سے
آج دل بپھرا ہوا ہے، دُور ہر انکار رکھ

زمیں کا چاند بھی وہ، مُشک بھی، گُلاب بھی وہ
جو برف ہو یہ لہُو، شہرِ آفتاب بھی وہ

مَیں اُس سے ہٹ کے کوئی اور خواب کیا دیکھوں
نظر کا نور بھی، پلکوں کا اِنتخاب بھی وہ

اُسی کے رنگ، مری جسّرتوں کے قالب میں
بدن رُتوں میں مہکتا ہُوا خطاب بھی وہ

اُسی کے عکس سے لفظوں میں جگنوؤں کا رقص
مرا سکُوت بھی، دریا کا پیچ و تاب بھی وہ

نقاب ڈال کے نِکلا ہے اپنے چہرے پر
ہے آپ اپنی حقیقت بھی اور خواب بھی وہ

تمام آئینے گونجے ہوئے، یہیں آ کر،
ہے آپ اپنا جواب اور لاجواب بھی وہ

کلیمِ حرف کی تہہ داریوں سے عاجز ہے
کلام جس پہ ہوا ختم وہ نصاب بھی وہ

وجودِ مہر کا حاکم بنائے ذرّوں کو
اُمڈتی شب میں ہے تقسیمِ ماہتاب بھی وہ

جمال دیکھ کبھی چشمِ یار سے اُس کا
کہ آئینوں کا ہے سب سے نرالا باب بھی وہ

30

وہ ہے ظاہر چھپا ہوا ہوں مَیں
اُس کو پہچاننے لگا ہوں مَیں

کیا مِلا مُجھ کو دائرہ بَن کر؟
اَپنے مرکز سے ہٹ گیا ہوں مَیں

وادیٔ مہر و ماہ سے گُل تک
روز و شب کِس کو ڈھونڈتا ہوں مَیں

ہے سَفر کا سِرا کہاں آخر
روز رَستے سے پوچھتا ہوں مَیں

کیا عجب موت زندگی بن جائے
زندگی تجھ کو پُوجتا ہوں مَیں

گاہ چلتا ہُوں، گاہ رُکتا ہُوں
جاگتی سوتی اک ہَوا ہوں مَیں

ہُوں تو لمحہ، مگر اَزل ہی سے
بوجھ صدیوں کا ڈھو رہا ہُوں مَیں

آسماں سَر سے ہٹ نہیں سکتا
کِتنا مجبُور ہو گیا ہُوں مَیں

گھر میں داخل ہو وہ کِسی بھی طرح
اَپنا دروازہ کھولتا ہُوں مَیں

وہ سزا مجھ کو آشنائی دے
غم نہ اک پل مجھے رہائی دے

پھر اندھیرا ہے میری گلیوں میں
شمع جلتی کوئی دکھائی دے

خوشبوئیں ہمرکاب ہیں، نہ کرن
راستہ کس طرح سجھائی دے

روز وہ قتل میں رہے شامل
روز اک نت نئی صفائی دے

درد کی بھیک مانگتا ہوں میں
میرے کاسے کو یہ بڑائی دے

رنگ جن کی طلب ہے دے اُن کو
مجھ کو بے رنگئ حسن زائی دے

مَیں نے خوں دے دیا ہے لفظوں کو
اب تو اندازِ دل رُبائی دے

ہے خموشی، خموشیوں کی زباں
شور کو ذوقِ خود ستائی دے

اُس کی یادوں کو آسمانی کر
اور رستوں کو دلکشائی دے

•

بڑھتی ویرانی کا غم خوش رنگ منظر کا چراغ
بجھ گیا شیشہ مگر جلتا ہے پتھر کا چراغ

زندگی مقتل سے ہے اس پار مصروفِ خرام
کامیابی چاہتی ہے تحفۂ سر کا چراغ

رفتہ رفتہ بجھ گئے سب کہکشانی راستے
رہنمائی کر گیا دستِ قلندر کا چراغ

بے بسی، عرفانِ حق سے اور روشن ہو گئی
نذرِ ظلمت ہو گیا روحِ سکندر کا چراغ

راستے گمراہیوں میں اپنی منزل پا گئے
جل رہا ہے اپنے ہی مرقد پہ رہبر کا چراغ

روشنیٔ دل جسے کہتے ہیں، وہ شئے اور ہے
زینتِ محراب کب بنتا ہے خود سر کا چراغ

کیوں فسردہ خواب میں رنگینیاں بھرتا نہیں
سنتے ہیں گل رنگ ہے خورشیدِ خاور کا چراغ

میں بھی پلکوں پر سجالوں عصرِ نو بڑھ کر اُسے
روشنی مجھ سی ہی دے جو میرے ہمسر کا چراغ

اب شکایت کی بھی گنجائش کہاں ہے اے ہوا
جل گئے ہم جس سے، وہ تھا اپنے ہی گھر کا چراغ

اِس دہکتی ہُوئی زر فشاں راہ میں منتظر کب سے ہے چاند اُس رات کا
جس کے دامن میں خوشبو بسیرا کرے، نُور پھُوٹے زمیں سے مری ذات کا

اک ندی میرے اندر ہے پھیلی ہُوئی، جس کی موجوں کی پُر کیف انگڑائیاں
میرے ساحل کی ویران سی آنکھ میں، رنگ بھرتی ہیں اپنے ہی جذبات کا

نُور دشمن ہے وہ، نُور دشمن ہُوں مَیں، نُور دشمن ہیں اب نُور کے قافلے
رات حیران خود اپنی ظلمت سے ہے، رات سے زخم کیسے بھرے رات کا

وہ تصوّر، تخیّل، نہ وہ رنگ و بُو، کُوچہ کُوچہ وہی یاسیت کا دھُواں
لفظ مُرجھا گئے، معنیٰ بے نُور ہیں، جب سے شعلہ بجھا ہے خیالات کا

تن پہ چادر خموشی کی ڈالے ہُوئے، کاٹ لیتا ہُوں یہ زندگی کا سفر
مجھ کو مہنگی پڑی لب کُشائی تری، زخم تازہ ہوا بات سے بات کا

کیا ہے سنگِ نظر، کیا ہے رنگِ ہنر، بھید چہروں کے اُس پر بھی کھل جائینگے
میری روشن بصیرت کے آئینے میں، کوئی چہرہ پڑھے میرے حالات کا

لمحہ لمحہ بڑھے آندھیوں کا جنوں، ذرّہ ذرّہ بچھیں زرد یاں خوف و خوں
کیا خلاصہ لکھیں سہمے سمٹے سے پر، اِن ہواؤں میں اُڑتے مقامات کا

دل کے روشن دہانے سے کٹ کٹ کے ہم گھر گئے اور اپنی ہی تاریکی میں
کیوں یقیں مانے بھٹکے ہوئے ذہن کو، ذہن رستہ ہے دُھندلے نشانات کا

کیا کروں اُس سے بازار کی گفتگو، قبر کی خامشی بھی ہے گویا وہاں
مَیں اگر لہر ہوں اپنے اظہار کی، وہ سمندر ہے رمز و کنایات کا

خود آگہی میں حسن کے خاکے بدل گئے
پتھر کے ساتھ وقت کے تیشے بدل گئے

وجدان و آگہی میں یہ شعلہ فگن ہے کون
روح و بدن کے طور طریقے بدل گئے

اندر کے اضطراب کو تنگی نہ تھی قبول
بھڑکا لہو، مکان کے نقشے بدل گئے

ہر قید طاق شعلۂ جاں پر عذاب تھی،
سنکی ہوا تو اور بھی شعلے بدل گئے

تو اپنی گرد و باد میں اب بھی اسیر ہے
منزل بدل گئی، یہاں رستے بدل گئے

پھر حرفِ حق کی راہ نمائی ہے گرد گرد
خود مست منّتوں کے صحیفے بدل گئے

میلے میں کیا روایتی چیزوں کے دام ہوں
بچوں کے ساتھ ساتھ کھلونے بدل گئے

الفاظ بھی نکیلے ہوئے وقت کی طرح
رنگین عبارتوں کے تراشے بدل گئے

ہے تو مکاں وہی مگر اے پُل صراطِ نو
دیوار ، در ، دریچے غزل کے بدل گئے

اپنی مٹی، سب کی مٹی ڈھوتا رہوں
بڑھتا جائے اور بھی رستہ کتنا چلوں

سورج ہوتا، گردش کرتا شام و سحر
مٹی کا پیکر ہوں آخر کیوں نہ تھکوں

ارمانوں کی راکھ سمیٹوں، یا خود کو
آنیوالے عہد کے حق میں آگ لکھوں

محشر زا اس دیدہ وری کی پلکوں سے
کرچی کرچی تیرا بکھرا عکس چنوں

شہر میں ہنگامہ برپا ہے چاروں طرف
میں بزدل سا اپنے گھر میں بیٹھا رہوں

موسمِ زر کے سُرخ صحیفے خاک ہوئے
کالی ہوا کا پتّی پتّی زخم سہوں

کیسے کہے گا مجھ کو جہاں شاہینِ فلک
سب کی پروازوں سے اگر اونچا نہ اُڑوں

نغموں کے ملبوس پہنتے ہیں الفاظ
اپنی ذات کو جتنا بھی تاروں سا کسوں

رنگ بدلتے روپ بدلتے چہروں میں
کوئی تو ایسا ہو جس کو یاد کروں

یوں تو سفر کے حق میں کئی کارواں اُٹھے
چلنا تھا جس طرح اُنہیں ویسے کہاں چلے

جذبوں کا اجتماد تھا لفظوں کے حق میں موت
وہ بھی لہو کی دھار میں بہتے چلے گئے

پھر آ گئی ہے بوڑھے درختوں میں سرکشی
پھر تازہ برگ و بار سے پودا نیا سجے

پھر اختلافِ وقت سے آنکھیں ملا کے ہم
اپنے لہو میں ڈوب کے آگے نکل گئے

گہرے سمندروں کا نیا اضطراب ہم
آئے ہماری آنکھ کے موتی کوئی چُنے

دیکھا تو منزلوں سے ذرا آشنا نہ تھے
دستار باندھے سر پہ کئی راستے ملے

ہم بھی کسی پہاڑ سا جلتے تو بات تھی
تنکوں سا بجھ گئے ہیں جلے بھی تو کیا جلے

ذرّات جستجو کو نیا آسماں دکھا
آنکھوں میں چبھ رہے ہیں یہ بے نور راستے

اب کس کو ڈھونڈنے چلا خود سے بچھڑ کے میں
شاید کوئی بگولہ تمہیں باخبر کرے

نور ہوں گرد کے ملبوس سے کتراتا ہوں
درد جس روپ میں آئے اُسے اپناتا ہوں

جس میں اخلاص نہ شامل ہو جبیں رُدو کا
جسم بھیجے کوئی تحفہ اُسے ٹھکراتا ہوں

آئینہ ہوں کہ رکھوں جہلِ خط و خال سے کام
جلوۂ شورشِ باطن میں سکوں پاتا ہوں

توڑ دیتا ہوں کبھی سینۂ دریا کا غرور
اور خود ہی کبھی قطرے میں سما جاتا ہوں

میں کہاں اور کہاں حرف و نوا کا سودا
میں بھی آندھی میں گھرا لو ہی سا تھراتا ہوں

ایک دن مجھ کو بھی مل جائے گا اپنا سورج
شب کی پہنائی میں جگنو سا اُڑا جاتا ہوں

عدل کی آیتِ پُر نور رقم کرتے وقت
مَیں کسی جبر کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں

بات اُس کی ہے اگر اپنی خطابت بے مثل
گفتگو اپنی اگر آئے تو گھبراتا ہوں

آپ کھل جاتے ہیں شبنم کے دریچے مجھ پر
گُل کی حسرت میں جہاں درد کو چمکاتا ہوں

روشنی زندگی ہوئی ہے مجھے
اب سفر کی خوشی ملی ہے مجھے

رہ گذر کون ساتھ ہے میرے
دھوپ بھی چھاؤں لگ رہی ہے مجھے

شورشِ گُل، صبا کے پردے میں
کوئی پیغام دے رہی ہے مجھے

سچ جو پوچھو، تو راہ کی دیوار
اپنی ہی آگہی ہوئی ہے مجھے

اس اندھیرے میں ہے اک ایسی کرن
گھر ہی پر جو لوٹتی ہے مجھے

توڑ دے نخوتوں کا شور و غرور
اب بھی حاصل وہ ہمدمی ہے مجھے

زندگی اک خلا ہے تیرے بغیر
آج کس بات کی کمی ہے مجھے

اک خلش ہے کہ پھانس ہی کی طرح
ہر گھڑی دل میں چبھ رہی ہے مجھے

ہے کشادہ بہت ہی دل کی گلی
ساری دنیا یہیں ملی ہے مجھے

شب کی سرپرستی میں ہم نے اپنے خوابوں کو بے چراغ کر ڈالا
یعنی آسمانوں نے، اپنے آسمانوں کو بے چراغ کر ڈالا

اِس عروجِ آدم میں، آدمی کی وحشت کی، یہ ہیں ننگی تصویریں
نوُر بار رشتوں نے، نوُر بار رشتوں کو بے چراغ کر ڈالا

زہر تھا زمینوں میں، یا ہوا سموُمی تھی، کچھ تو کہہ صبا آخر
توُ نے شام سے پہلے، جگمگاتے باغوں کو بے چراغ کر ڈالا

غم کی رہ گذاروں میں کچھ تو چین مِلنا تھا، اپنی تیرہ بختی کو
کیوں سُلگتے ہونٹوں نے لالہ زار آہوں کو بے چراغ کر ڈالا

زندگی کی زینت تھے، نکہتِ گلستاں تھے، اپنے غم سے روشن تھے
کیا کہوں ہوا تجھ کو، توُ نے غم نژادوں کو بے چراغ کر ڈالا

ترجمانِ آب و گل، شعلۂ مہِ کامل، جانِ مہرِ تاباں بھی
غم نے بڑھتی ظلمت میں، کیسے اپنے اشکوں کو بے چراغ کر ڈالا

اُس کے شوخ آنچل سے کٹ کے لفظِ خودسر نے اپنی خود پرستی میں
زندگی کے صحرا میں رنگ بھرتی غزلوں کو بے چراغ کر ڈالا

نت نئے مکاں ملتے، روشنی کے رستوں کو، راستے اگر چلتے
منزلوں کے نشّے نے، آگے بڑھتے قدموں کو بے چراغ کر ڈالا

سورجوں کی حسرت میں اُس دیئے سے چھُوٹے ہم جو مکاں کی رونق تھا
رو رہے ہیں اس غم میں ہم نے ہنستی راتوں کو بے چراغ کر ڈالا

اشکوں کو جلے دل کی دُعا مان رہے ہیں
مجبور ہیں، منصب کا کہا مان رہے ہیں

غالب ہیں، نہ ہم میر، نہ ہم عصر کے تابع
ہم اپنا کہا، اپنا سُنا مان رہے ہیں

جس فکر میں شامل ہے سنک اپنے لہو کی
اُس پھول کو مطلوب ہوا مان رہے ہیں

اس تپتی ہوئی ریت سے پہنچے ہیں بھنور تک
تب خود کو سمندر کی صدا مان رہے ہیں

دل کا کوئی رشتہ نہیں ہونٹوں کے بیاں سے
ہم کیسے کہیں ہم کو وہ کیا مان رہے ہیں

اب اُن کی حریفائی کا مفہوم رہا کیا
جب لوگ ہمیں اُن سے سوا مان رہے ہیں

ادوار کے ہر رنگ میں پرکھیں گے اُنہیں ہم
وہ خود کو اگر سب سے جدا مان رہے ہیں

خوشبو بھی تو اک رنگ ہے مٹّی ہی کے گھر کا
بے رنگی کو رنگوں کی جلا مان رہے ہیں

آغاز کی تجدید کی صورت ہے یہی اک
انجام کو آغاز نما مان رہے ہیں

زمیں بے نور ہو جائے گگن بے نور ہو جائے
مرے بجھنے سے ساری انجمن بے نور ہو جائے

مرے بکھراؤ میں ہے اجتماعِ جلوۂ فردا
نہ میں بکھروں تو ذرّوں کا بدن بے نور ہو جائے

مرا چہرہ ہے اُس آئینۂ ہستی کا آئینہ
یہ ممکن ہی نہیں آئینہ تن بے نور ہو جائے

اُسی کے قرب سے روشن مری آنکھیں مرا دل بھی
بھٹک جاؤں اگر، وہ پیرہن بے نور ہو جائے

وہی اک پھول تو ہے باغِ ہستی، نازشِ جلوہ
وہ بکھرے تو رہِ سرو سمن بے نور ہو جائے

ٹپکتا ہے وہی تو قطرہ قطرہ سنگ سینوں سے
وہ تھم جائے، رم گنگ و جمن بے نور ہو جائے

وہی سینے پہ ڈالے ابر کا آنچل اڑے ہر سو
رکے تو بجلیوں کا بانکپن بے نور ہو جائے

وہی ہے آگ بھی، دریا بھی، جلتی پیاس بھی تم بھی
نظر پھیرے تو کوئی جان و تن بے نور ہو جائے

اسی اک پیڑ سے قائم مرے سائے کی شادابی
کٹوں جڑ سے تو سینے کی جلن بے نور ہو جائے

روشنی سے روشنی کی دشمنی اچھی نہیں
رات سر پہ ہے ہمارے، بے رخی اچھی نہیں

کوئی جگنو ہاتھ پر رکھ لے پنے ہی انداز کا
پُر خطر رشتوں کی بڑھتی تیرگی اچھی نہیں

ہم خیالی کی فضاؤں میں جو رخنہ ڈال دے
وہ قرابت، وہ خوشی، وہ ہمدمی اچھی نہیں

اپنا اوچھا پن نمایاں خود ہو اپنی ذات سے
ہو کسی صورت میں وہ شائستگی اچھی نہیں

گاہے گاہے انبساطِ نور کی بارش بھی ہو
ہنستے چہرے پر اداسی ہر گھڑی اچھی نہیں

یہ بجھا ڈالے گی اک دن اپنے سینے کا چراغ
آندھیوں کی زد پہ روتی بے دلی اچھی نہیں

پیاس ہونٹوں کی بڑھا دے اور دے کاسوں کو بھیک
وہ فقیری بانٹتی شاہنشہی اچھی نہیں

ابر کے پیروں میں کیوں زنجیر پہناتی نہیں
کہہ رہی ہے جب ہوا، آوارگی اچھی نہیں

اپنی ہی دیوانگی سے چھاؤں پیدا کیجیے
دھوپ میں در در بھٹکتی آگہی اچھی نہیں

کون منسوب ہُوا ہے مجھ سے
میرا سایہ بھی جُدا ہے مجھ سے

اَب وہی جانے ہو پورا کب تک؟
اُس نے وعدہ تو کیا ہے مجھ سے

میری آنکھوں سے کہاں تک دُوری
شورشِ ناز و ادا ہے مجھ سے

یہ بھی انداز انوکھا اُس کا
خود پہ ظاہر ہے چھُپا ہے مجھ سے

چھین لو مجھ سے مرا دستِ ہُنر
آئینہ ٹوٹ گیا ہے مجھ سے

میرے قدموں کی بلندی مت پوچھ
عرش شرمندہ رہا ہے مجھ سے

تنگ گلیوں سے نکل، پڑھ مجھ کو
شہر تابندہ ہُوا ہے مجھ سے

اپنے کرتوت سے چلتا ہے پتہ
جیسے بیزار خدا ہے مجھ سے

مصلحت سے کوئی رشتہ نہ سلوک
بس یہی سب کو گلہ ہے مجھ سے

تیرگی میں گھنے اُجالے ہیں
غم کے رستے بڑے نرالے ہیں

ٹوٹ کر راستہ دکھائیں نیا
پتھر و آئینے جیالے ہیں

ہم ہیں اور درد کا طویل سفر
جتنے رشتے تھے توڑ ڈالے ہیں

کٹ گیا سر مرا، مگر یہ دیکھ
اُسکے ہاتھوں میں غم کے چھالے ہیں

اُس کی نظروں نے آگ پیدا کی
میرے اشکوں نے چاند ڈھالے ہیں

خاک نے خاک کی تباہی کے
کیا طریقے نئے نکالے ہیں

بڑھ گئی اور آئینہ بستی
سنگ تے سنگ تو اچھالے ہیں

گمرہی کا جہاں تھا اندیشہ
ہم نے وہ موڑ بھی سنبھالے ہیں

دوستی ہو کہ دشمنی، اپنے
سارے انداز دیکھے بھالے ہیں

پتھروں کے جہاں سے لوٹ آئے
آئینے تھے وہاں سے لوٹ آئے

شہرتیں ہر طرف تھیں جام بکف
کوئے نام ونشاں سے لوٹ آئے

اُن میں کس بل نہ تھا لڑائی کا
نرغۂ دشمناں سے لوٹ آئے

ظلمتیں مل رہی تھیں تحفے میں
محفلِ مہ وشاں سے لوٹ آئے

آگ سے خواہشوں کا دامن بھی
کلفتِ جاوداں سے لوٹ آئے

خامشی بن گئی چراغِ بدن
شورِ لفظ و بیاں سے لوٹ آئے

پھانس تلوؤں کی زندگانی ہے
لذّتِ کامراں سے لوٹ آئے

کوئی گوشہ نہ تھا وہاں روشن
بزمِ وہم و گماں سے لوٹ آئے

غم بہت تھا زمیں سے کٹنے کا
ہم درِ آسماں سے لوٹ آئے

تجھ سے ملنے کی کوئی روز ہی تدبیر کروں
پھول کی شاخ سے پیدا کوئی شمشیر کروں

مجھ کو غنچوں کے قفس بھی کہاں راس آئیں گے
کیوں نہ احساس کو بیگانۂ زنجیر کروں

سوچتا ہوں کہ ہر اک رات کو خوں سے سینچوں
اور ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر کروں

اپنی توقیر کو دفنانا پڑے گا مجھ کو
اپنے ہونٹوں سے اگر اپنی ہی تحقیر کروں

کھل کے پھر کیوں نہ پڑھوں آپ کی چاروں سمتیں
مجھ پہ لازم ہے اگر آپ کی توقیر کروں

اک خطا اور کروں اپنے تعارف کے لئے
پھر خطاؤں کو سپردِ غمِ تعزیر کروں

ہے یہی خوں مجھے بازو بھی، گھنا جنگل بھی
اپنے ہی خون سے پیدا، کوئی نخچیر کروں

آنکھ کی قدر نگاہوں سے اُتر جائے گی
میں بھی تنکوں کو اگر آپ سا شہتیر کروں

رُخ بدل جائے ابھی راہ کے اندھیاروں کا
جل کے میں خود کو اگر مشعلِ رہگیر کروں

کب کسی کوہ کی تنبیہہ سے ڈرتی ہے سحر
ہم دبائیں جو اسے اور ابھرتی ہے سحر

رات کے زعم کی دیوار کو ڈھانے کیلئے
شہر خورشید سے آگے بھی گزرتی ہے سحر

غسل کرتی ہے تو کرتی ہے لہو سے اپنے
اپنے سورج کی حرارت سے نکھرتی ہے سحر

کوئی اس راز سے اک دن تو اٹھائے پردہ
رات دن کس کیلئے اتنا سنورتی ہے سحر

کیا اسے ملتا ہے اس رات کے دروازے سے
رات بھر اتنا لہو صرف جو کرتی ہے سحر

خون دیتا ہے اسے تازہ کفن پھولوں کا
جب کسی شام کی دہلیز پہ مرتی ہے سحر

رُخ بدلتے ہوئے رستوں کی تمنّا کی طرح
نت نئے روپ میں سینے میں اُترتی ہے سحر

ظرف رکھتی ہے مکانوں کی چھتوں سے اونچا
کوئی روزن ہو اسے نور سے بھرتی ہے سحر

صرف بستی نہیں شاخوں سے بھی شور اُٹھتا ہے
آتے آتے کہیں اک پل جو ٹھہرتی ہے سحر

ہنستے شیشے رُلا گئے دُکھ میں
اپنے، اپنے کہاں رہے دُکھ میں

اپنی سانسوں پہ ہو گمانِ غیر
دل پہ آرے چلا گئے دُکھ میں

ساتھ رہتے تھے جو ہمیشہ ہی
اُف وہ سائے بھی کٹ گئے دُکھ میں

ایسے گھر جن سے آس تھی سُکھ کی
اور نامہرباں ہوئے دُکھ میں

بھیڑ سے کیا غرض، بس اک سایہ
پیار کرتا ہوا ملے دُکھ میں

نازؔ ہے تم پہ پاؤں کے چھالو
صحرا صحرا تمہیں چلے دُکھ میں

بس وہی غمگسارؔ ہے اپنا
اپنے ہر دُکھ کو جو سُنے دُکھ میں

آنکھ کی پُتلیوں سے دھڑکن تک
جتنے چہرے تھے سب کُھلے دکھ میں

عُمر بھر سامنے رہیں گے مرے
جو مسیحا نفس چُھپے دُکھ میں

قطرہ ساکت ہے آبشار نہیں
یہ مری شکلِ انتظار نہیں

آگ ہی آگ ہے مرا سینہ
یہ کوئی جلوۂ شرار نہیں

منزلِ اعتبار ہیں ہم لوگ
رہگذار رو، کوئی غبار نہیں

دھول بھاری چٹان لگتی ہے
عزم شیشہ جو پائیدار نہیں

کیا ہو تسکین آبلۂ پا کی
اب تو صحرا بھی شعلہ بار نہیں

اپنا ڈیرا کہاں لگاؤں میں
یہ رعونت بھرا دیار نہیں

غم ہی روحِ حیات ہے میری
غم سے لڑنا مرا شعار نہیں

حوصلہ بازوؤں کو تیغ کرے
ورنہ تلوار میں بھی دھار نہیں

زخمِ سایہ، نہ دھوپ کی یورش
یہ نگر اپنا ہم شمار نہیں

سب کے دُکھ سب کے ستم جھیل رہا ہے کوئی
عام رستوں سے بہت دُور بسا ہے کوئی

اب بھروسہ مجھے کیا آئے گا دیواروں کا
اپنے ہی گھر سے جدا کر کے، گیا ہے کوئی

وہ بچھڑنے کا ہی لمحہ تھا، جہاں دُور تلک
روتی آنکھوں سے مرے ساتھ چلا ہے کوئی

ہم کہ پانی کی طرح ایک ہی رنگت پہ رہے
اور مٹی کی طرح رنگ بدلتا ہے کوئی

لفظ خود اپنے ہی معنے کا بھرم کھوتے ہیں
اپنی ہی بات سے دانا جو پلٹتا ہے کوئی

مَیں ہواؤں میں بٹا ابر کے ٹکڑوں کی طرح
ذات کی اندھی گپھاؤں میں دھنسا ہے کوئی

اپنی آنکھوں سے خزاں دیکھوں تو اُسکو جا کر
سُنتا ہوں، غیرتِ گلزار بنا ہے کوئی

تشنگی اپنی، کہ دریا سے نہیں شرمندہ
موجۂ ریگ سے سیراب ہوا ہے کوئی

فن کے دُشمن ہیں سبھی اپنے یا بیگانے ہوں
رابطہ کب پھول کا شعلے سے رہا ہے کوئی

جواں تھے ہم بھی، جواں زندگی کا ساتھ رہا
جہاں بھی رات ہوئی روشنی کا ساتھ رہا

تونگری سے تو اپنا نباہ ہو نہ سکا
خوشی ہے درد بھری مفلسی کا ساتھ رہا

سمجھ گئے تھے سکوتِ ہوا کے رمز کو ہم
اسی لئے تو سدا ، بے کلی کا ساتھ رہا

ہوئی ہے ساز کے پردوں میں پرورشِ غم کی
ہوا کے ہُنک حسین نغمگی کا ساتھ رہا

یہ درد و غم یہ خوشی ہم پہ کس طرح کھلتے
ہمارا اُن کا فقط دو گھڑی کا ساتھ رہا

سُلگتے کرب کو دل میں چھپا لیا ہم نے
کہ چہرہ چہرہ نئی تازگی کا ساتھ رہا

ہم اپنی پیاس کی تصویر کھینچتے کیسے
سمٹتے کوزوں کی دریا دلی کا ساتھ رہا

بدن میں پھول کوئی کھلتا، نذر کر دیتے
دھواں دھواں اسی بے چارگی کا ساتھ رہا

سلام پڑھنا ہے ہم سب کو اپنی قبروں پر
دوام بن کے یہاں کب کسی کا ساتھ رہا

میرا غم دو جہاں سے آگے ہے
یہ مکاں، ہر مکاں سے آگے ہے

ذرۂ خاک محتسب نہ بنے،
خاک اپنے زماں سے آگے ہے

کم سنی بڑھ گئی بزرگی سے
سایۂ وہم و گماں سے آگے ہے

اس حسیں کے مکاں کا ہر جلوہ
سرحدِ شہرِ جاں سے آگے ہے

ٹوٹتے آئینوں کی گہرائی،
موجۂ بے کراں سے آگے ہے

اپنی تاثیر کی رسائی میں
اشک، برقِ تپاں سے آگے ہے

کوئی حد ہی نہیں بلندی کی
آسماں آسماں سے آگے ہے

کیا مہذّب ہے گفتگو، دل کی،
بے زباں، با زباں سے آگے ہے

پاسباں رہ گیا بہت پیچھے،
میرا گھر پاسباں سے آگے ہے

سوزِ آفاق سے محروم ہوا کا دامن
کون آنکھوں سے لگائے گا حنا کا دامن

زندگی روٹھی جو ہم سے تو منانے ہم بھی
ہاتھ میں تھامے ہوئے نکلے قضا کا دامن

دشمنِ جاں ہی نہیں دشمنِ کردار بھی ہیں،
جن سے منسوب رہا اپنی وفا کا دامن

سب کے دامن سے چھٹے ہم تو یہ محسوس ہوا
سب کے دامن سے کشادہ ہے خدا کا دامن

جاگتی شب کو ہی شبنم نہیں تسکین دے
جلتے ہاتھوں پہ رکھے پھول دعا کا دامن

پیڑ خوشبو کے بسیرے کو ترس جائیں گے
یوں ہی پھیلے گا اگر جلتی چتا کا دامن

ہم اسی خاک سے کر لیں گے گلستاں پیدا
ملتفت صرف رہے تیری عطا کا دامن

سینۂ مقتل ویراں سے کرن پھوٹتی ہے
مانگے قربانیٔ خوں صبر و رضا کا دامن

خاک سے ملنے لگا میری ستاروں کا ہجوم
چاک ہاتھوں نے کیا جونہی انا کا دامن

رات ویران اپنے خوابوں سے
کیا ملا ہم کو آفتابوں سے

خود زخم تھے نہ چاک داماں تھے
ساری وحشت بڑھی گلابوں سے

ہم بھی نقصاں کی مد میں شامل ہیں
سخت محنت ترے حسابوں سے

ذہن کی گرد کیوں نہیں ہٹتی
نور میں ڈوبے ان نصابوں سے

اہلِ دانش میں ہو شمار اپنا
آج ہم جڑ گئے کتابوں سے

سائلوں کو، سوال یاد نہیں
وقت کے سر پھرے جوابوں سے

تم نہ مانو، یہ ہے الگ قصّہ
رات پھیلی ہے ماہتابوں سے

تنگ ہیں وقت کے تقاضے خود
اِن خطیبوں سے اِن خطابوں سے

بحر کے راز جاننے ہیں اگر
اپنا رشتہ رکھو حبابوں سے

آگ نے جب کوئی تصویر جلائی تیری
آگ میں بن گئی گلزار خدائی تیری

منتِ غیر کے داغوں سے نہیں شرمندہ
میرے دامن کی بڑائی ہے بڑائی تیری

دستِ ناکارہ کو اعجازِ مسیحائی دے
حکمتیں بھول گئیں راہ نمائی تیری

اپنے ہی حسن کے جلوے سے ہوئی ہے بدمست
خاک پر کیسے کھلے جلوہ نمائی تیری

دردمندی بھی اگر چاکِ گریباں ہو گی
سنگ دل کب کوئی مانے گا رسائی تیری

اُس کے پیکر میں تری ذات سمائی ہوگی
جس نے آواز سرِ بزم اُٹھائی تیری

پھر وہی آئینہ محبوب نظر ٹھہرا ہے
جس نے ہر عکس میں بارات اُٹھائی تیری

جتنی تصویریں تھیں آبادی کی سب چیخ پڑیں
کِس نے ویرانی میں تصویر بنائی تیری

آسماں اپنی مُنڈیروں پہ جو رکھتا ہے چراغ
خاک کو اور ستاتی ہے جُدائی تیری

بے مکانی پر تری اُونچے مکاں قرباں ہوئے
تو وہی جلوہ کہ سُورج دیکھکر حیراں ہوئے

بھوک میں بھی تُو نے رکھّا اپنا رشتہ سنگ سے
ترلوِ لے کب تری چاہت کے گھر مہماں ہوئے

تُو نے چاہا چل پڑے تو نے کہا تو رک گئے
بہتے دریا سب نے دیکھا تابعِ فرماں ہوئے

حکمرانی کر رہے ہیں آج بھی تیرے فقیر
اور وہ تجھ سے کٹے آباد گھر ویراں ہوئے

تیرا سینہ کیا بجھا ہے بجھ گئی ہے کائنات
تو وہی شعلہ کہ روشن کوچۂ امکاں ہوئے

کٹ گئے ہیں آسماں تیری شعاعِ تیغ سے
تیرے بازو کب حریفِ قوّتِ انساں ہوئے

تو نے ایسی آب کھو دی بس یہی افسوس ہے
گوہرِ یکتا زمانے کب ترے ویراں ہوئے

قطرۂ خونِ جگر سے بحرِ غم ایجاد کر
خاک کے ذرّے اسی میں ڈوب کر تاباں ہوئے

پھر وہی اخلاص پیدا کر زبانِ سوز میں
جس سے پتھر بھی پگھل کر نکہتِ ایماں ہوئے

میں پیاس کی شدّت میں کھلا تازہ کنول ہوں
اِس تپتی ہوئی ریت میں دریا کا بدل ہوں

آندھی ہو کہ برسات سمٹتا ہے مجھی میں
عرفان کی تختی پہ لکھا حرفِ اٹل ہوں

اِک رُخ سے مرا جائزہ محدود رہیگا
مَیں دائرہ در دائرہ بحرِ غزل ہوں

جمنا مری جانب بھی کبھی ایک نظر کر
مَیں ذات کے دریا کا نیا تاج محل ہوں

کاغذ کی اسیری نے بڑھائی ہے بصیرت
اب سنگ ہی تھی کاسہ میں شعلوں کا عمل ہوں

مَیں دشت کی ویران سی آنکھوں میں چمکتا
مطلوب جو گُل کو ہے وہی شوریدہ پل ہوں

روشن ہیں مرے خون سے وجدان کی طاقیں
مَیں عقل کا ہر نقش مٹاتا ہوا جل ہوں

سورج سے بہت آگے مرے نور کا ڈیرا
پیچیدہ گزرگاہوں کا آسان سا حل ہوں

جُھلسے ہوئے ادوار کے بے رنگ بدن کو
بے رنگی میں خوش رنگیٔ صحرائے ازل ہوں

حسرتوں کا چاند ہے وہ زندگی دے جائے گا
رات پھیلے گی جہاں بھی روشنی دے جائے گا

اُسکے لب سورج ہیں اُسکی گفتگو پھولوں سی ہے
بجھتی خاموشی کو اپنی تازگی دے جائے گا

ساحلوں سے بیر اُس کو آہٹوں سے پیار ہے
بہتا دریا ہے سفر کی بے کلی دے جائے گا

وہ شرارِ غم ہے کر کے اپنے ہی سینے کو چاک
پتھروں کو شعلہ پیکر نغمگی دے جائے گا

دھوپ والو دھوپ میں چلتے رہو اُس کیلئے
وہ ہی اِک دن راستوں کو چاندنی دے جائے گا

مطمئن ہے خاک اُس کا پھول سا ہنستا بدن
آنسوؤں کو رنگتوں کی ہر خوشی دے جائے گا

پستیوں کا غم بھی ہے میری بلندی میں شریک
اب زمیں کو آسماں اپنی کمی دے جائے گا

دُوریوں کے کرب سے چھلنی ہوا جاتا ہے تن
جانے کب وہ قربتوں کی ہمدمی دے جائے گا

رُوح کیا سیراب ہو دریا کا ہے پل بھر کا ساتھ
وہ بچھڑ کر عمر بھر کی تشنگی دے جائے گا

ہر چاند سے باتیں کیسے کروں ہر پیڑ سے سایہ کیا مانگوں
میں آگ بھٹکتی منزل کی ٹھہرا ہوا دریا کیا مانگوں

یہ برگِ نوا شاداب تو ہو موسم کا یقیں بھی کر لوں گا
جلتے ہوئے دیکھا ہے گل کو اس قہر سے سبزہ کیا مانگوں

بے نور ہوئی ہے دل کی گلی احساس کی سنّت مرنے سے
انسان کی اجڑی شکلوں سے آبادی کا نقشہ کیا مانگوں

پھر پتّی پتّی دھول بجھی پھر شبنم شبنم آگ لگی
گلشن پہ دھوئیں کا قبضہ ہے خوشبو کا دریچہ کیا مانگوں

کچھ اور بڑھے دل کی دھڑکن کچھ اور بجے پازیب تری
سنّاٹے کی ویراں بستی سے مہکا ہوا نغمہ کیا مانگوں

دریائے محبت کا ساحل اُس شوخ کا رنگیں آنچل ہے
اِس ڈوبتے کٹتے ساحل سے لہروں میں کنارا کیا مانگوں

اِس درد کو زندہ رکھے ہوا عشق کا سفر بھی طے ہوگا
جب نور رہے خود میرے اندر راتوں سے اُجالا کیا مانگوں

میں رات کی گہری ظلمت میں اُس چاند کا طالب ہوں
یہ شمعیں کہاں وہ رات کہاں رستوں سے سہارا کیا مانگوں

یہ موسم دل کا موسم ہے ہر آن بدلتا رہتا ہے
صد رنگ قبائیں کم ہیں یہاں اجڑا ہوا رستہ کیا مانگوں

آوارگی شرمندہ نظر آئی ہے گھر میں
کیا جانئے کیا چیز اتر آئی ہے گھر میں

صحرا میں جسے اہلِ نظر ڈھونڈ نہ پائے
وہ راہ گذر ہم کو نظر آئی ہے گھر میں

ہر قطرۂ خوں بن گیا پیمانۂ خوشبو
یہ کیسی صبا موجِ شرر آئی ہے گھر میں

یہ چھت تو گھنی چھاؤں کی خاطر ہی بنی تھی
پھر دھوپ بنا پوچھے کدھر آئی ہے گھر میں

سمتوں کی پریشانی کو تسکین ملی ہے
وہ خلدِ نظر سمتِ سفر آئی ہے گھر میں

ہم اُس کے تصوّر میں ذرا دیر جو سوئے
بیدار ہر اک چیز نظر آئی ہے گھر میں

یہ چاند نہیں ہے ترے قدموں کی ضیا ہے
جو درد کی تقسیم کو در آئی ہے گھر میں

ہم اپنے ہی حالات میں تنہا سے کھڑے تھے
اک ایسی بھی افسردہ ڈگر آئی ہے گھر میں

خوشبو کیلئے ہاتھ بڑھایا تھا مکاں نے
بے درد ہوا دھول بھی بھر آئی ہے گھر میں

ہم نے مانا چراغِ جاں ہو تم
وقتِ شب مہرباں کہاں ہو تم

سارے سورج کھڑے ہیں نیزہ بکف
مجھ پہ سایہ فگن جہاں ہو تم

آندھیوں میں نظر نہیں آتے
یوں تو جانے کہاں کہاں ہو تم

بولتے کیوں نہیں مظالم پر
کیا مری طرح بے زباں ہو تم

سخت بارش گھٹا اندھیرا ہے
کیا بسوگی تم میں جب دھواں ہو تم

فاصلہ کون پاٹ سکتا ہے
میں مکاں اور لامکاں ہو تم

یوں تو بنجر ہوئی ہے ساری زمیں
اک مہکتا سا گلستاں ہو تم

جلتے صحرا کی کوکھ سے پھوٹا
اپنے ہی خوں کا سائباں ہو تم

ہم چراغوں سے دوریاں کیوں ہیں
روشنی جو اگر مکاں ہو تم

خوں کی موج ہوں یک رنگ نظاروں میں نہ دیکھ
گرمیٔ خاک مجھے چاند ستاروں میں نہ دیکھ

مَیں تغیّر ہوں تغیّر ہے مری روحِ عظیم
مجھ کو اُجڑے ہوئے دریا کے کناروں میں نہ دیکھ

مَیں نے مانا کہ تری لَے کے ستارے ہیں اسیر
میری لَے میری تڑپ اپنے حصاروں میں نہ دیکھ

پیکرِ دار کی گُل پیرہنی ہے مجھ سے
رنگتیں خون کی معروف بہاروں میں نہ دیکھ

وعدہ ہُوں پھول کا سینہ ہے ٹھکانہ میرا
مجھ کو الفاظ کی ویران قطاروں میں نہ دیکھ

جگمگاتے ہوئے شہروں کی نئی دھڑکن میں
مجھ کو اسلاف کے سُنسان مزاروں میں نہ دیکھ

مَیں فلک پیما نیا شعلہ صراطِ غم کا
میرا قد بُجھتی کتابوں کے شراروں میں نہ دیکھ

دشتِ ویراں کو مری آبلہ پائی نکہت
بخششِ ابر مری راہ گذاروں میں نہ دیکھ

ہے اگر آنکھ تو بڑھ آپ مرے شعلوں کو
مجھ کو دم توڑتے بے رنگ دیاروں میں نہ دیکھ

شعلۂ خاک اگر اُس کی ہوا میں اُڑتا
روح بن کر وہی بازارِ خدا میں اُڑتا

میری شادابی نے باندھا ہے مجھے شاخوں سے
خشک ہوتا جو یہ پتّہ تو ہوا میں اُڑتا

مَیں غرض پوجتا احساس ہوں چھوٹے گھر کا
کِس طرح درد کے پھیلاؤ دُعا میں اُڑتا

آپ کھُل جاتے یہ اسرار گھنے رنگوں کے
وہ جو اپنے ہی لہو اپنی صدا میں اُڑتا

خود ہی بے نور تھا یہ لفظوں کا نیا صنعت گر
کیسے جگنو کی طرح شب کی فضا میں اُڑتا

گردشِ شعلۂ جوّالہ کہاں ابر کہاں
ایک محتاجِ ہوا کیسے خلا میں اُڑتا

چاند تاروں کا پجاری ہے شعورِ انساں
بات تو جب تھی کہ تکمیلِ انا میں اُڑتا

میرے زخموں کے اگر رنگ سمجھ لیتا وہ
پھول کو رنج کے نہ یوں گردِ حنا میں اُڑتا

وہ سمندر ہے زمیں تیری جلا چاہے گا
بوند ہوتا تو فقط اپنی جلا میں اُڑتا

سکوں حاصل نہ ہوگا انجمن میں
اگر اُلجھا ہے دل اُس پیرہن میں

لہو میں گُھل گیا ہے چاند کوئی
اُجالا ہی اُجالا ہے بدن میں

یہ تلوے کس طرح شاداب ہونگے
اگر کانٹے نہیں صحنِ چمن میں

ستاروں سے بھر لیے تیرا دامن
وہی ویرانیاں میرے گگن میں

لبِ ساغر سے پہنچی تیغِ غم تک
ہماری پیاس سینے کی جلن میں

مخالف آسماں ہو یا زمیں ہو
بڑھے گی آگ خوشبو کی لگن میں

سحر ایسے ہی تو آئی نہیں ہے
کٹی ہے شب چراغوں کے جتن میں

نظر لڑ جائے بس اُس کی نظر سے
بدل جاتے ہیں ویرانے چمن میں

اگر خوشبو نہیں اُسکے قدم کی
سمٹ جاتا ہے رستہ اپنے تن میں

نہیں کوئی منزل محبّت سے آگے
عبادت یہی ہے عبادت سے آگے

اُسے اپنے خنجر سے کٹنا پڑا خود
بڑھی تھی رذالت شرافت سے آگے

کڑی دُشمنی کا کٹھن راستہ ہے
رفاقت، محبّت، عنایت سے آگے

مجھے نیکیوں کا نشہ لے نہ ڈوبے
جزا مانگتا ہوں شفاعت سے آگے

ابھی فرضِ حق ہی ادا ہو نہ پایا
قدم ڈھونڈے رستہ اطاعت سے آگے

ذرا سوچنے دے اے خوابِ جوانی
ضعیفی کی گرتی عمارت سے آگے

اِمامت ہی کیا اُس کی خاطر بھی لڑتا
جو ہوتی کوئی شئے اِمامت سے آگے

ٹھہرنا نہیں میری فطرت میں شامل
مَیں کُلفت بڑھاتا ہوں راحت سے آگے

یہ مُردوں کی صحبت تجھے مار دے گی
جلا اک دِیا زندہ صحبت سے آگے

وحشتیں باندھ پروں میں اپنے
بجھ گئی برف گھروں میں اپنے

پھول کی چھاؤں جلاتی ہے ابھی
آگ سودا تھا سروں میں اپنے

بڑھتی بینائی میں ظلمت کیوں ہے
آج کے دیدہ وروں میں اپنے

لفظ زندہ ہیں محبت مُردہ
غم کہاں نقطہ وروں میں اپنے

قوم بھی مالِ تجارت ہی تو ہے
بوالہوس سوداگروں میں اپنے

روشنی کیسے مقیّد ہو گی
سب کو یہ فکر گھروں میں اپنے

اُن صفوں میں ہیں دشمن اپنا
ڈھونڈیئے راہبروں میں اپنے

کون جینے کی بشارت دے گا
ہم ہیں خود نوحہ گروں میں اپنے

پیٹ مسجود ہے ساجدؔ فن ہے
تو کہاں خوش نظروں میں اپنے

کیوں یہ دل زخموں کا دیوانہ بنا تو ہی بتا
کون تھا زخموں میں خود جلوہ نُما تو ہی بتا

شہر کی ویران رونق پوچھتی ہے مجھ سے کچھ
کیا کہوں اب تیرے بارے میں ذرا تو ہی بتا

اور بھی تو گھر تھے آخر خوش نما اِس شہر میں
اِنتقاماً کیوں مرا اک گھر جلا تو ہی بتا

شورِ تنہائی سے جب بیزار ہو جاتا ہوں مَیں
کون تنہائی میں دیتا ہے صدا تو ہی بتا

تیرا آنا، مسکرانا آنسوؤں کے چاند کا
کون تیری خوشبوؤں میں بس گیا تو ہی بتا

آگ سی دہکی ہوئی ہے یاد کے گلدان میں
اِس طرح تیرے لیے کوئی جلا تو ہی بتا

ریت کے کنگن میں کھِلتے موسموں کے رنگ تھے
عکس کس کا آنکھ کے دریا میں تھا تو ہی بتا

تیرا کٹنا میرا کٹ جانا ہے اپنے آپ سے
کب رہا میں اپنے سائے سے جُدا تو ہی بتا

راستہ میرے تعاقب میں چلا ہے عُمر بھر
میں مگر کس کے تعاقب میں رہا تو ہی بتا

ہوا کے ہاتھ پہ جس نے دیا جلایا ہے
اُسے بھی اہلِ زمیں نے بہت ستایا ہے

وہ تتلیوں کے مکانوں میں کس طرح رہتا
جو مہر و ماہ کے سپنوں کو روند آیا ہے

یہ عشق ذات ہے پابندِ حدّ ذات نہیں
بڑھا جو حد سے اِسے کون روک پایا ہے

اُسے میں پھول کا ہمزاد کس طرح کہہ دوں
مکان جس نے گھنی آگ میں بنایا ہے

میں اُسکی چھاؤں میں بیٹھوں تو اور جلتا ہوں
وہ پیڑ جس نے مری چھاؤں کو گھٹایا ہے

زمین سر پہ اُٹھائے زمیں پہ دوڑائیں
زمیں ہی نے مگر خاک میں ملایا ہے

اُسے سمجھ تو لوں اے فاصلو ذرا ٹھہرو
وہ ایک عمر کے بعد اب قریب آیا ہے

بدن تھا آگ کا، دریا لباس تھا اُس کا
وہ پھول جس کی کرن نے مجھے جلایا ہے

مَیں ریگِ دشتِ محبّت ہوں میری قدر کرو
مری تپش کو فلک نے گلے لگایا ہے

زندہ جب تک ہیں ستا لو شعلو
کچھ تو ہم سے بھی دُعا لو شعلو

لکڑیاں ہم سی نہ مل پائیں گی
اپنے چولہے تو جلا لو شعلو

آگے دریا ہیں نہ دریا کا سُراغ
ٹھیک سے پیاس بجھا لو شعلو

بستیاں سج گئیں دُلہن کی طرح
حسرتیں اپنی — نکالو شعلو

کیوں ہنسے کوئی تمہارے ہوتے
پھول پہ قبضہ جما لو شعلو

چاند اُترے نہ کسی آنگن میں
اَور اُونچائی بڑھا لو شعلو

بَرق رَفتار ہوا ہے سبزہ
اَپنی دَستار سنبھا لو شعلو

خُشک مٹّی کی بھی آنکھیں نَم ہیں
اب تو خیموں کو سجا لو شعلو

یہ مَکاں ہوں گے نہ اَپنا ڈیرا
آگ کا جشن مَنا لو شعلو

ہے اگر معنے کی خوشبو تجھ میں لفظوں میں اُتر
پہلے اپنی جاں کا عارف بن تو غزلوں میں اُتر

آنسوؤں کے ساتھ ہی احساس کے موتی بھی ہیں
جاگتی پہنائیوں سے دل کی لہروں میں اُتر

ہے انہیں رنگوں کے پیچھے دل کی وہ پرانی چھپی
درد پڑھ اطراف کا پھر میرے غنچوں میں اُتر

کشتیوں کے ساتھ دریا پار کرنا کیا کمال
آگ کا دعویٰ اگر ہے تجھ کو شعلوں میں اُتر

سورجوں کی بھیڑ میں کھو جائے گا تیرا وجود
جگنوؤں کا ہمسفر ہو میری راتوں میں اُتر

پھول کی ٹہنی پہ تتلی کا بسیرا عام ہے
غم اگر رکھتا ہے سب کا خشک پتّوں میں اُتر

بے بسوں کے خون پہ بنیاد کیوں ہو ذات کی
تیغ رکھتا ہے اگر ہاتھوں میں حملوں میں اُتر

چاند تاروں کا تصرّف آشنائے غم نہیں
تو اگر ہمّت ہے خود ہمّت کے پردوں میں اُتر

خود بخود پہچان ہو جائے گی میرے عصر کی
چھوڑ کر اپنا مکاں میرے دریچوں میں اُتر

جو زخمِ جستجو شعلہ سہے گا
سرابِ رنگ و بُو دریا بنے گا

فریبِ آرزو تنہا اُٹھے گا
لئے جام و سبُو صحرا چلے گا

گلابوں کا وضو آدھا رہے گا
اگر شہرِ نمُو شعلہ نہ دے گا

لہو پھیلا، نہ دی آوازِ گُل نے
تو کیسے سُرخرُو رستہ رہے گا

مرا ادراک آگے بڑھ گیا ہے
جنوں پیاسا لہُو پیچھا کرے گا

وہ رشتہ جوڑ لے اپنا کسی سے
مخالف کُو بہ کُو سایہ ملے گا

بہت پھیلاؤ ہے نکتے کے اندر
حصارِ گفتگو کتنا بڑھے گا

سبُو اندر سبُو وہ چاند روشن
سبُو اندر سبُو شعلہ اُٹھے گا

وہ اپنی پیاس کا عارف ہُوا ہے
ہو دریا رُو برُو تنہا چلے گا

نشانِ شہرِ یاری بن گیا ہے
وہ سفلہ کب سے گیانی بن گیا ہے

ہوئی ہے کاسہ لیسی ختم جس پر
امیرِ غمگساری بن گیا ہے

بڑی قسمت ہے دو لفظوں کے پیچھے
وہ سردارِ معانی بن گیا ہے

گلی بھی آشنا جس سے نہیں ہے
بھرے شہروں کی شیخی بن گیا ہے

ابھی سایہ طلب ہے ذات اُسکی
اچانک کیسے بدلی بن گیا ہے

یہی دیہاتی تو سب کچھ تھا اُس کا
یہ تیلی کب سے شہری بن گیا ہے

بُھلا کر سب کو وہ احساں فراموش
نظر میں اوڑے مٹّی بن گیا ہے

ہمارا کیا بُنا، بگڑا ہے اُس کا
جو رُوحِ بحر و بر بھی بن گیا ہے

ملے اک دن ہمارے آسماں سے
جو اپنے قد کا حامی بن گیا ہے

اَندھیرے گھر کو اُجالوں کا ہار دینا ہے
اِدھر سے اک نیا سُورج گزار دینا ہے

تری اَنا کا بہت قرض بڑھ گیا مجھ پر
کٹا کے سر مجھے قرضہ اُتار دینا ہے

نظر جُھلسنے لگی ہے غرورِ شعلہ سے
زباں کو پھر سے گُلوں کا شعار دینا ہے

یہ لہر لہر سمندر میں تیرگی کب تک
حُباب کو شرفِ آبدار دینا ہے

بدن پہ داغ بنی ہے شرار کی چادر
شجر کو پھر ثمرِ شعلہ بار دینا ہے

بلا سے جنگ ہو موسم کی خود ستائی سے
نئی ہوا کو نیا اعتبار دینا ہے

یہ دیکھنا ہے مہکتا نہیں لہو کب تک
جہانِ شعر کو اپنا وقار دینا ہے

اذانِ صدق و صفا دے کے شہر شہر یونہی
مجھے تو نقشِ محبّت اُبھار دینا ہے

مَیں حرفِ نور بنوں کوئی راستہ وہ چُنے
تراشنے کا اُسے ــ اختیار دینا ہے

خودسریٔ سنگ کو شیشوں سے پگھلاتے رہو
آگ کو یوں آنسوؤں کے رمز سمجھاتے رہو

مقبروں سے پھول چن لو اپنے ہنستے خواب کے
زندگی مردہ نہیں احساں کو ٹھکراتے رہو

توڑ دو اپنے لہو کی گرمیوں سے ہر حصار
راستوں میں حسرتوں کی آگ بھڑکاتے رہو

خاک عرفان و صداقت کا حقیقی راستہ
خاک ہی کو شعلۂ باطن سے چمکاتے رہو

روشنی گل سے ملے یا پیاس سہتی ریت سے
روشنی کو خوشبوؤں کی شکل اپناتے رہو

جسم ہے بیساکھیوں کے قرب سے مرجھائے گا
سرد سانسوں کو نئے اِمکاں سے گرماتے رہو

یہ سفر جاری رہے گا پانیوں کی لہر کا
ہے جہاں تک خشک مٹی رنگ پھیلاتے رہو

چھاؤں کہتے ہیں جسے وہ دھوپ کے سینے میں ہے
دھوپ ہی میں دھوپ کے پرچم کو لہراتے رہو

آرزوؤں کا بسیرا ہی شجر کا حسن ہے
نت نئی رنگیں قبائیں اِن کو پہناتے رہو

ناکامیوں کے رنج نے چہرہ بُجھا دِیا
لیکن چراغ ہم نے ہوا میں جلا دِیا

اک شعلہ دے گیا ہے برائے نمودِ ذات
جس نے ہوس کی راہ میں ہم کو بُھلا دِیا

واقف ہوئے جو درد کے اعلیٰ مقام سے
ہر نقش ہم نے یاس کا دل سے مِٹا دِیا

دونوں جہاں کی وسعتیں ہم میں سِمٹ گئیں
خوش ہو رہا ہے کوئی کہ گھر سے چھڑا دیا

یہ کیسا راستہ ہے کہ دیوار ہی نہیں
ہم نے تو منزلوں کو قدم سے مِلا دیا

ہم نازِ وہمِ ذات سے آزاد تو ہوئے
اچھّا ہُوا کسی نے نظر سے گِرا دِیا

جس روپ میں بھی آئی ہے اپنا لیا تجھے
کچھ تو بتا حیات ہمیں تو نے کیا دِیا

یہ سچ ہے اور پھول بھی خوش رنگ ہیں مگر
اُس پھول کو بھی دیکھ جو ہم نے کھلا دِیا

پھر ڈھونڈنے چلی ہے اُسے کُو بہ کُو نظر
دیوانہ جس نگاہ نے ہم کو بنا دِیا

رات کی جھیل میں کھلتے ہیں کنول خوابوں کے
دیکھنا ہے تو کھلے رکھنا کواڑ آنکھوں کے

سوچوں کا بھی بھرم آپ یہ کھل جائے گا
زخم پڑ جیسے کبھی تہہ دار تھکنے اشکوں کے

اُڑتی تہذیب کے بے رنگ بکھرتے پتّو
اب وہ رشتے نہ رہے رستوں سے دروازوں کے

اب تو یہ سوچ کے اشکوں سے بھی ڈر لگتا ہے
شبنمیں ہاتھوں نے کاٹے ہیں گلے شعلوں کے

پھر مغنّی مرے نغموں کو نئی لَے بخشتے
پیرہن سب سے نرالے ہیں مرے لفظوں کے

اُجلے قدموں کی بشارت سے ہوئے ہیں محروم
میری آنکھوں سے پڑھے زخم کوئی رستوں کے

درد کی لہر سمندر میں جلاتی ہے چراغ
رات افسانے سُنائے نہ بجھی لہروں کے

سنگ بیدار ہوئے نُور مکاں میں پھیلا
آہٹو! کس نے جلائے ہیں دیئے قدموں کے

میں بھی رِشتوں کی اسیری سے نہیں ہوں آزاد
لاکھ رہتا ہوں مکانوں سے الگ اینٹوں کے

لگتا ہے ہر خلا ہمیں اب تو بھرا بھرا
اُس نے بچھڑ کے رنگ یہ ہم میں جُدا بھرا

موسم کا یہ مزاج تو پہلے نہ تھا کبھی
مقتول زرد و خشک ہے قاتل ہرا بھرا

دعوؤں کے ساتھ ہم میں سمندر اُتر گئے
کِس سے ہماری پیاس کا اب تک گھڑا بھرا

کاسوں سے کیسی شانِ سخاوت بیاں کروں
مَیں خالی ہاتھ اور ہے میرا خدا بھرا

جتنا قریب جاتا ہوں ہوتا ہے شہر دور
وحشت نے راستوں میں عجب فاصلہ بھرا

آنکھیں ہماری اب بھی اُداسی کا جال ہائیں
خوں تو ہی پوچھ اُس نے نیا رنگ کیا بھرا

تنہائی در تک آئی مگر کچھ نہ کہہ سکی
اُس کا مکان بھیڑ سے اکثر رہا بھرا

خوشبو قریب آئے تو بڑھتی ہے آگ اور
شعلہ یہ کیسا تو نے بدن میں ہوا بھرا

شعلوں میں گل کھلانے کا دعویٰ اُسی کا تھا
کافور کیسے ہو گیا لہجہ دُعا بھرا

قدم کی تازگی بیساکھیوں میں مت ڈھونڈو
غزل کا نور جلی پستیوں میں مت ڈھونڈو

دل و دماغ کی مٹّی کے پھول ہیں ہم لوگ
ہمیں شجر کی تہی دستیوں میں مت ڈھونڈو

کشادگیٔ معانی کی چاندنی ہم سے
کرن کو شب کی گھنی تنگیوں میں مت ڈھونڈو

یہ شاہراہِ بصیرت ہے عام سب کے لئے
محبّتوں کی ڈگر سختیوں میں مت ڈھونڈو

نئے سفر کو نیا آئینہ دیا ہم نے
ہمارے عکس کو گمراہیوں میں مت ڈھونڈو

حصارِ سنگ میں شعلوں کی پرورش کی ہے
یہ آگ برفزدہ خامیوں میں مت ڈھونڈو

کہاں وہ اور، کہاں مہر و ماہ کی حسرت
ہمارا زادِ سفر کرچیوں میں مت ڈھونڈو

شجر کے تن پہ ہے جو کچھ تمہارا حصّہ ہے
لہُو کا ذائقہ پرچھائیوں میں مت ڈھونڈو

اَنا کا درس دیا ہے ہمیں نے لفظوں کو
ہمیں شعور کی پامالیوں میں مت ڈھونڈو

موج لہرائی ہے مدہوش جوانی کی طرح
کاٹ پھر کیوں نہیں بہتے ہوئے پانی کی طرح

میرے چمکیلے عقائد، ترے مخمور سے خواب
ریت میں جذب ہیں دریا کی روانی کی طرح

سیپیاں اِن کی حفاظت سے گریزاں کیوں ہیں
آنکھ کے موتی ہیں انمول نشانی کی طرح

کس طرح تلخ حقائق کا نشاں پائیں گے
لوگ پڑھتے ہیں اگر مجھ کو کہانی کی طرح

مجھ کو اِلفاظ کی چھاگل میں سمائی نہ ملی
اور وہ شخص کہ چُپ ماہی رہا گیانی کی طرح

شام نے جیسے ہی سینے سے ہٹایا آنچل
جل گئی گیان کی لَو مجھ میں بھی دھیانی کی طرح

میری قیمت ترے بازار میں سب سے کم تھی
مجھ پہ کیوں سوچتے پھر لوگ گرانی کی طرح

بدگمانی تھی کوئی سمتِ سفر میں حائل
تیر سے کھنچتا گیا میں بھی کمانی کی طرح

رات حاسد تھی کئی روپ میں چھائی گھر پر
میں درخشاں ہی رہا سوزِ نہانی کی طرح

خموش کیوں ہے مرا ہمسفر خبر ہے کِسے
ٹھہر گئی ہے کہاں رہگذر خبر ہے کِسے

یہ لوگ اپنا ہی چہرہ سنبھالے بیٹھے ہیں
بکھر گئی کہاں میری نظر خبر ہے کِسے

وہ اپنے خوں میں سمادھی لگائے بیٹھا ہے
تمام مُشک ہوئے بال و پر خبر ہے کِسے

زمیں میں دھنس گئے اپنے مکاں کیساتھ ہی وہ
بنی ہے کیسا گردِ سفر خبر ہے کِسے

بھٹکتی آس تری رہگذارِ تیرہ میں
ہوں روشنی درِ معتبر خبر ہے کِسے

نظر کے دعوؤں سے جو دور تھا بہت ہی دور
تھا بستیوں میں وہی دیدہ ور خبر ہے کسے

ہم اُس کو روز ہی اخبار کی طرح پڑھتے
اُسے نہیں تھی خود اپنی خبر خبر ہے کِسے

وہ سامنے ہو تو کچھ اُس سے دل کا درد کہوں
نظر نظر ہے خبر ہے خبر خبر ہے کِسے

وہ اور در ہے جہاں ہم بکھر گئے اکثر
کہاں ہیں ہم کہاں اپنی نظر خبر ہے کِسے

مجھ کو اپنا کے اگر ایسے ہی ٹھکرانا ہے
اُس نے پھر درد کے رشتوں کو کہاں جانا ہے

شہر سر پر وہ اُٹھا لے مری ضد میں لیکن
اُس کو اک روز مرے گھر کیطرف آنا ہے

چند لمحوں کی ملاقات پہ تکیہ نہ کرو
ہم نے اُس شخص کو اک عمر میں پہچانا ہے

وہ کوئی بات نہ مانے یہ ہے مرضی اُسکی
بدگمانی کا سبب ٹھیک سے سمجھانا ہے

زندگی ہم کو تری وسعت و رفعت کیلئے
ہو کرن یا کوئی خوشبو لے اپنانا ہے

آئینہ آئینہ چہروں کی نئی فصل اُگے
تجھ کو اے ابرِ کرم کھل کے برس جانا ہے

وہ شفق زارِ تمنّا نہیں کیا آنکھ لگے
چاند تاروں سے یونہی نیند کو بہلانا ہے

ایسی اونچائی کیا رشتہ ہی زمیں سے نہ رہے
اب پہاڑوں کی بلندی سے اُتر جانا ہے

آؤ پھر لوٹ چلیں اپنے مکانوں کی طرف
دل کی تسکیں ہے نہ وہ باغ نہ ویرانہ ہے

جب بھی روشن مری تنہائی کا شعلہ ہوگا
آئینہ سامنے ہوگا نہ وہ چہرہ ہوگا

خیمۂ گرد ہوں آندھی میں سنبھالے رکھنا
سانس کی ڈور کٹے گی تو تماشا ہوگا

دُھن تھی سورج کی مجھے ہوش کہاں تھا اِسکا
دور دیوار سے دیوار کا سایہ ہوگا

بستیاں جلنے لگیں اپنے خُنک رستوں میں
آج پھر چاند کسی بام پہ اُترا ہوگا

اپنی بینائی میں رکھتا ہے اگر وہ دجلہ
اُس نے اِس قطرے میں دریا بھی تو دیکھا ہوگا

وہ ہرا پیڑ جو موسم کی ردا ہے اوڑھے
دیکھ اندر سے اُسے آگ میں جلتا ہو گا

اِس میں عالم کا غم و درد تو بھر جانے دے
اَن گنت صدیوں پہ بھاری یہی لمحہ ہو گا

ہے یہی نقشِ محبّت جسے حاصل ہے دوام
اپنے دعوے میں کھرا کب کوئی شیشہ ہو گا

اُس نے تاریکی میں جس موڑ پہ چھوڑا تھا مجھے
اب وہی موڑ اُجالوں بھرا رستہ ہو گا

پھیلا کے خوشبوؤں کا دامن جلا رہا ہے
وہ راستوں کو اپنے گھر سے بچھڑا رہا ہے

ویرانیوں کے رستے سنّاٹے بھر کے مجھ میں
وہ اپنی بے بسی کو مجھ سے چھُپا رہا ہے

نقطے کے اندروں میں سو دائرے چھپے ہیں
نقطہ سمٹ کے خود میں نقطہ بڑھا رہا ہے

سورج بھی جل رہا ہے آتش نژاد ذرّو
پردے میں کون ہے جو سب کو جلا رہا ہے

اپنے بہاؤ میں بھی ٹھہراؤ ہے اُسی کا
دریا سمٹ گیا ہے ساحل بہا رہا ہے

وہ ریت ریت بس کر پھولو نکی وادیوں میں
مجھ کو ہنسا رہا ہے مجھکو رُلا رہا ہے

جب شعلۂ ہوس کو روشن کیا ہے مجھ میں
کیوں اپنی سرحدوں پر مجھ کو بُجھا رہا ہے

پتوار مانگتی ہے تجھ سے بھنور کا رستہ
تو خواب ساحلوں کے کس کو دکھا رہا ہے

بربادیوں میں اپنی آباد مجھ کو کر دے
ہر انتقام ہنستی تعبیر ڈھا رہا ہے

سُلگتی شام تنہائی کا بڑھتا فاصلہ ہوگا
مگر اُس میں بھی قربت کا کوئی نقطہ رہا ہوگا

گھروں کو پھونک کر گھر گھر اجالا بانٹنے والو
ہماری خاک سے شعلہ کوئی اُٹھا تو کیا ہوگا

جلیں گے ہم بھی ان لفظوں کی محرابوں میں اوروں سا
ہماری فکر کی لو کا مگر پرتو جدا ہوگا

محبت ایک رُخ ہے ایسے پوری بات کیا ہوگی
ہماری نفرتوں کا ذکر بھی اُس نے کیا ہوگا

نقابیں ڈال لیں گے آپ پتھر اپنے چہروں پر
ہمارے درمیاں جب بولتا اک آئینہ ہوگا

بلندی اور پستی میں بدل جاتے ہیں خود ہم بھی
یہاں قد دوسرا ہوگا وہاں قد دوسرا ہوگا

کُشادہ شہر جب بھی تنگ ہو احساس وحشت پر
چلے آنا ہمارے گھر کا دروازہ کھُلا ہوگا

یہ کوتاہی ہے اپنی ہم نے اُس کو یاد نہ رکھا
بچھڑتے وقت اُس نے تو پتہ اپنا دیا ہوگا

نہیں سورج تو کیا یہ آس کا جگنو تو باقی ہے
اندھیرے میں یہی اے رات اپنا رہنما ہوگا

مجھ کو اُلجھن میں جس نے ڈالا ہے
وہ اندھیرا نہیں اجالا ہے

اصل لہروں کی ایک ہے لیکن
رُکنے بہنے کا ڈھب نرالا ہے

اب اُسے کیسے چھوڑ دوں تنہا
جس نے دُکھ میں مجھے سنبھالا ہے

اپنی کمزوریاں چھپانے کو
اُس نے مجھ کو بہت اُچھالا ہے

دھوپ کا ہم کو دے گیا تحفہ
ہم نے سائے میں جس کو پالا ہے

خون ہی خون کا بنے دشمن
خون ہی خون کا سنبھالا ہے

وہ بھی تسکیں کو رو رہا ہوگا
جس نے دل سے ہمیں نکالا ہے

نور بخشنے کا میری راتوں کو
وہ بدن روشنی کا ہالا ہے

درپئے جاں تھا وہ کڑا لمحہ
پوچھ مت کیسے اُس کو ٹالا ہے

سورج ڈھلا ہے سر کو چھپانے کی بات کر
انجامِ گل کو دیکھ ٹھکانے کی بات کر

تُو کیسے موتیوں کی چمک میں اُلجھ گیا
اپنے لہو کے یکتا خزانے کی بات کر

تخریب کے ہزاروں ہی نسخے ہیں سب کے پاس
بگڑے ہوئے جہاں کو بنانے کی بات کر

اس اجتماعِ رنگ کو کیا فکر دھول کی
پھر دھول دھول بکھرے فسانے کی بات کر

محلوں کی رشتگی میں کہاں پائیداریاں
بے چارگی میں رشتہ نبھانے کی بات کر

طاقت کہاں کہ اپنا جنازہ بھی ڈھو سکوں
کاندھوں سے اپنی لاش اُٹھانے کی بات کر

تسکین کچھ تو ہو دلِ ایذا پرست کی
اونچائیوں سے سب کو گرانے کی بات کر

وارفتگیٔ شوق کی تہذیب ہے یہی
روٹھا اگر ہے کوئی منانے کی بات کر

شبنم کے آئینوں میں رہے عکسِ گُل بھی کیوں
تو پتّی پتّی آگ لگانے کی بات کر

جو دل کے پاس تھا اب دل سے دُور ہے وہ بھی
دکھوں میں جیسے بھٹکتا سا شعُور ہے وہ بھی

مَیں جیسے دن کے اُجالوں کی ترجمانی ہوں
اندھیری رات میں اپنا ظہُور ہے وہ بھی

قدم قدم پہ رُلائے گا مجھ کو بستی میں
عظیم فتنۂ شورِ نشُور ہے وہ بھی

یہ سبزہ زار نہ جب تک دھوئیں میں ہونگے شمار
جلے گا خود بھی کہ شہرِ فتوُر ہے وہ بھی

اگر حقیقتِ مطلق سے بے خبر ہوں مَیں
سرابِ جلوۂ حور و قصُور ہے وہ بھی

رقم سبو پہ اگر ہے مری سیہ بختی
ہوس گزیدۂ جامِ طہور ہے وہ بھی

رکھے گا لاج وہی میرے سر جھکانے کی
کہ سر بلندیٔ عفو قصور ہے وہ بھی

کئی دنوں سے مجھے ہوش ہی نہیں اپنا
کئی دنوں سے بہت دور دور ہے وہ بھی

غموں کی طرح دریدہ لباس ہوں میں بھی
سفر سے اپنے بہت چور چور ہے وہ بھی

درد و غم کی مئے سے خالی جب کوئی شیشہ نہیں
مجھکو تیری ذات سے مالک کوئی شکوہ نہیں

ہے زباں دانی بھی ننگی میرے نیچے عصر کی
خوش بیانی جز خموشی اب کوئی چارہ نہیں

جس کی بینائی سُلگتے دل کی گہرائی پڑھے
بھیڑ تو آنکھوں کی ہے لیکن وہی چہرہ نہیں

نقطہ نقطہ ضو فگن۔ بہتی لکیروں کا جمال
دائرہ منسوب ہو جس سے وہی نقطہ نہیں

کیا لگا ہوں کی تمازت میں کھلے کوئی گلاب
راہ میں حائل کوئی چلمن نہیں پردہ نہیں

میں پرانے چاک سے آیا نئی پوشاک تک
چاک کر میری قبا مجھ میں اگر نکتہ نہیں

روکنے والا بکھر جائے گا خود اِن کو ہوا
باندھ لے پرچھائیوں کو ایسا آئینہ نہیں

دل اگر بینا ہے ہر ذرّے میں ہے اِک آفتاب
ورنہ آنکھوں پر کھُلا جلوہ یہاں جلوہ نہیں

ذرّہ ذرّہ انکشافِ جستجوئے ذات ہے
خاک کی دیوانگی کا تجھکو اندازہ نہیں

اُمّید کی مشعل جو ترے دل میں جلے گی
مایوسی کوئی حال ہو پیچھا نہ کرے گی

آ، دور سسکتی ہوئی تنہائی سے مل لیں
یہ محفلِ احباب تو تا دیر رہے گی

پھر تازہ نئی آگ بھرو اپنے پروں میں
پتھّر کی ردا اوڑھے ہوا ہم سے لڑے گی

مجھ کو تو بہر حال اُتر جانا ہے تہہ میں
کب تک یہ زمیں اپنی دراڑوں میں چھپے گی

مٹّی کا ہر اک رنگ ہے منسوب ہمیں سے
ہم اٹھ گئے جس روز یہاں خاک اڑے گی

آوارگی پہچان نہ بن پائے گی اپنی
یہ پیچ ہے کہ سائے کی طرح ساتھ رہے گی

محلوں نے بھی تسکیں کیلئے ڈھونڈا ہے جسکو
وہ درد کی لو مٹی کے آنگن میں ملے گی

یہ ناز یہ انداز نہ یہ رنگ رہے گا
جس روز مرے دل کی لگی تجھ سے کٹے گی

میں راکھ لئے نکلا ہوں جسموں کے سفر کی
ناداں ہے اگر مجھ سے ہوس کچھ تو کہے گی

وہ تو بادل تھا مجھے اُس نے جلایا کیسے
رنگ کو رنگ کی بستی سے چھڑایا کیسے

جھوٹی تحریر بھی تختی پہ رہی ہے محفوظ
حرفِ حق میں تھا اگر اُس نے مٹایا کیسے

معجزہ پُشت پہ تھا یا کوئی شعلہ تہہِ دل
بوجھ قطرے نے سمندر کا اُٹھایا کیسے

دُشمنی اُس کی ہے پہچان اگر پھر اُس نے
صُلح کا ہاتھ مری سمت بڑھایا کیسے

ہم سے ہی پوچھ کہ پتھر کی گھنی بارش میں
ہم نے شیشے کو سرِ راہ بچایا کیسے

ہم تھے واقف اگر انجامِ سفر سے اپنے
ہم نے مٹّی کے گھروندوں کو سجایا کیسے

اِک کرن ہم نے بھی کی اپنے لہو سے تخلیق
آسماں پوچھ اندھیروں نے ستایا کیسے

کب کہا مَیں نے گناہوں سے مبّرا مَیں ہوں
پارسائی کا سبق اُس نے پڑھایا کیسے

ہے اگر دھوپ مجھے چھت کی بھی محتاجی ہے
مجھکو ہمزادِ خدا غم نے دکھایا کیسے

آگ جب دل میں جدائی نے لگائی ہوگی
اُس کی تصویر تری آنکھوں میں آئی ہوگی

ہم بگولے ہیں ملا ہے ہمیں صحرائی مزاج
تنگ کوچوں میں کہاں اپنی سمائی ہوگی

حق کے اعلان میں خطرہ تھا بہت اُسکے لئے
اُس نے ہونٹوں پہ سچی بات چھپائی ہوگی

وہ جو ویران سا پھرتا ہے گلی کوچوں میں
ایک بستی بھی کہیں اُس نے بسائی ہوگی

گھر نے پائے میں دبا کے کسی سچائی کو
جھوٹ کی خوشنما دیوار اُٹھائی ہوگی

مَیں بھی اُس راہ کو اپناؤں گا سب کی خاطر
سارے عالم کیلئے جس میں بھلائی ہوگی

اُس نے چھوڑا ہے اگر خطروں میں مجھ کو خطرو
کوئی صورت بھی تو بچنے کی دکھائی ہوگی

اُس حقیقت میں کہاں نیند کی گلیوں کا شمار
خواب نے خواب کی تصویر بنائی ہوگی

رنگ و بو اپنے لُٹا دے اسی ویرانے میں
سچّے گلشن کی یہی سچّی بڑائی ہوگی

آؤ رشتوں کی گفتگو کر لیں
سنگ کیسامنے سبو کر لیں

آئینہ کون، کون ہے پتھر
فیصلہ سب کے روبرو کر لیں

تشنگی لائی ہے اسے ہم تک
درد کہتا ہے ہم سبو کر لیں

پشت الجھا رہی ہے باتوں کو
بات جو بھی ہے دوبدو کر لیں

ساتھ اس کا ہمارا برسوں کا
کسطرح دوست کو عدو کر لیں

سفر کی منزل قریب آئی ہے
اپنے ہی خون سے وضو کر لیں

آبرو کا وقار ہے ہم سے
ہم ہی احساسِ آبرو کر لیں

کھو گئے لوگ اپنے چہروں میں
ہم ہی باطن کو خوبرو کر لیں

بارشوں سے تو بات بنتی نہیں
خواب کو شعلۂ نمو کر لیں

قریب آ مجھے اک بات تجھ سے کرنی ہے
یہ زندگی ہے کہ تاراج دل کی بستی ہے

مری خوشی ہے ترا درد بانٹ لینے میں
تری خوشی سے کٹوں میں تو آنکھ روتی ہے

میں راستے کے تصوّر سے کانپ اٹھتا ہوں
طویل میرا سفر اور عُمر چھوٹی ہے

نہ کوئی چاند نہ تارا نہ کوئی پرچھائیں
مری ہی طرح مری رات بھی اکیلی ہے

گیا ہے کوئی پرندہ اُداسیاں دے کر
سُنہری شاخ کی مُسکان کتنی پھیکی ہے

کسی نے آج مرے دل کے زخم کو پوچھا
فسردہ شب میں نئی روشنی سی پھوٹی ہے

تمہاری یاد سے روشن تھیں ساری محرابیں
یہ شمع جب سے بجھی ہر منڈیر سونی ہے

میں ساحلوں کی طرح کٹ رہا ہوں اندر سے
یہ تیرا غم ہے کہ مجھ سے خوشی ہی روٹھی ہے

کبوتروں کی بھی آواز اب نہیں آتی
چھتوں نے جب سے محبّت کی رسم چھوڑی ہے

رستہ بھی وہی گھر بھی وہی تُو بھی وہی ہے
یہ کیسی ہوا ہے جو مجھے ڈسنے لگی ہے

وہ شام سے پہلے ہی بجھا اپنے سفر میں
رستوں کے پہنچنے میں بہت دیر ہوئی ہے

ہم پہنچے تو سُلجھی ہوئی ہر بات بھی اُلجھی
تم پہنچے تو بگڑی ہوئی ہر بات بنی ہے

شرمندہ ہے سائل کی طرح آج مکاں بھی
دروازوں نے کیا جانئے کیا بات کہی ہے

عنواں کی طرح اب یہ بدل جائے تو اچھا
ہم نے یہ کہانی کئی عنواں میں سُنی ہے

وہ کل کی طرح آج بھی آیا نہیں، سچ ہے
ہم آ گئے صحرا یہی اک بات بڑی ہے

رُوحوں کا تخاطُب بھی ہُوا رُوح کو دشوار
ہر جسم میں اک جسم کی دیوار کھڑی ہے

بہتے ہوئے پانی کو کوئی غم نہیں ہوتا
پانی سے اگر پانی کی تحریر مٹی ہے

بن جائے گا اک دن وہی خورشیدِ جہاں تاب
وہ نقطۂ فن جس پہ نظر اپنی جمی ہے

نہ خیال اپنے وجود کا نہ خیال تیرے مقام کا
مَیں ہوائے تیز ہوں دشت کی مجھے ہوش کب تھا قیام کا

جو سروں سے نوچ کے پھینک دے کسی طرح چادرِ عرش کو
مَیں نقیب ایسی نگاہ کا میں غلام ایسے امام کا

رگِ گُل سے گرمیٔ خار تک کوئی شعلہ شعلۂ جاں نہیں
یہ عطا ہے موسمِ نازکی کہ کرشمہ تیرے نظام کا

مری چاروں سمت خداؤں کا وہ ہجوم ہے کہ زباں بھی چپ
یہ غلام تیرا بتائے کیا کہ مقام کیا ہے غلام کا

نئے موسموں سے اُنہیں ملا جو غبار بن کے بکھر گئے
میں ہوں پھول اپنی ہی شاخ کا کوئی رنگ مجھ میں دوام کا

مجھے آئینوں کی تجلیوں نے سُپرد کر دیا رات کے
مری خاک تجھ سے طلب کرے کوئی عکس ماہِ تمام کا

یہ عجیب وادیٔ ہوش ہے یہاں زخم تک نہیں محترم
جہاں قتلِ گل پہ صبا ہنسے وہاں مجھ کو حکمِ خرام کا

وہی گرد ہے وہی فاصلے وہی گمرہی وہی بے دلی
ہے تلاشِ ذات کہ کٹ گیا ہے سفر پیامِ وسلام کا

میں دھنک حصار کو توڑ دوں میں لہو بھی اپنا نچوڑ دوں
کوئی موجِ سینۂ ریگ سے مجھے پھول دے مرے نام کا

پھولوں نے دیئے زخم کے نذرانے سفر میں
ہم نکلے تھے کانٹوں کو بھی اپنانے سفر میں

کھُلتے ہی مسافر کا بھرم بھول سے اپنی
اپنے بھی تو بن جاتے ہیں بیگانے سفر میں

دیوار کا سایہ مری پہچان نہیں ہے
پہچانتا ہے جس کو وہ پہچانے سفر میں

مانوس گزرگاہوں سے قیمت میں سوا ہے
ملتی ہے اگر خاک بھی انجانے سفر میں

تلوؤں کی جلن کا کوئی حل ہی نہ ملے گا
بادل جو اُٹھے پیاس کو بھڑکانے سفر میں

میں رازِ سفر اُن سے بیاں کیسے کروں گا
آئے ہیں طبیعت کو جو بہلانے سفر میں

وہ باز نہ آئے گا کبھی اپنے سفر سے
جس شخص کو مٹ جانا ہے کچھ پانے سفر میں

بس خون کی گردش میں رہے شعلہ سا روشن
افسانے بھی رہتے نہیں افسانے سفر میں

ہر عصر کے چہرے کو پڑھو اِن کے سہارے
لبریز ہوئے آنکھ کے پیمانے سفر میں

آگ اُگلتے ویرانوں میں چاند کی فصلیں بونے چلا ہوں
رات سمیٹے اپنا دامن میں اشکوں کی گرم ہوا ہوں

دستِ فلک کیوں ہاتھ بڑھائے کیوں اپنے سینے سے لگائے
پھول کی غم خواری سے ہٹ کر میں اپنے مطلب کی دُعا ہوں

شب کی چٹانیں کٹ جائیں گی درد بشارت دینے لگا ہے
میں صدیوں کا کرب سمیٹے نُور کا تیشہ بن کے اُٹھا ہوں

آگ کا موسم بھی آیا تو وہ شبنم میں ڈھل جائے گا
آندھی جس کی خود ہے نگہباں میں ایسی دھرتی پہ اُگا ہوں

جب بھی دھوپ کی زد پر آ کے ارمانوں کی فصل جلی ہے
شادابی کا دریا بن کر میں ہی چاروں اور بہا ہوں

اپنے قدم کے نقش نہ ڈھونڈو اپنا چہرہ مجھ میں نہ دیکھو
میں انجانی منزل غم کی انجانے رستے کی صدا ہوں

خوشبو کے بھیگے سائے میں ریت کا دامن سبز ہوا ہے
تیرا غم سینے سے لگائے صحرا صحرا پھیل گیا ہوں

اوروں کے انجام کو دیکھو مجھ سے اگر نسبت رکھنی ہے
نیند سلگ اٹھتی ہے جس سے میں ایسے خوابوں کی ردا ہوں

میں نے ادب کے فن پاروں سے پہلے اپنا لوٗر بڑھایا
خوب کھنگالے گہرے سمندر تب اپنے لفظوں میں بسا ہوں

شب چھپائے، ہما ہمی میں جیا
عمر بھر کون روشنی میں جیا

آئینہ آئینے سے شرمندہ
کون بے داغ زندگی میں جیا

زر ترستا رہا خوشامد کو
اک فقیر اپنی مفلسی میں جیا

تشنگی درد بانٹتی ہے جہاں
پیکرِ غم اُسی گلی میں جیا

بے خودی کو دوام بخشے گا
جو دہکتی ہوئی خودی میں جیا

خلعتِ نور اُس کو پہناؤ
غم چھُپائے جو بیکسی میں جیا

آسماں تھا وہ اپنی بستی کا
پر زمیں تیری سادگی میں جیا

وہ کوئی شب نژادہی ہو گا
رات اوڑھے جو تیرگی میں جیا

اپنی چھت سے نہ آسکا باہر
خاک وہ اپنی دُشمنی میں جیا

خوش فہمیوں کی رات کو ماتم سحر کا ہے
یہ قحط ہے نظر کا کہ دھوکہ نظر کا ہے

جگنو کی شال اوڑھے کھڑا تھا کوئی شجر
بارش کو یہ گمان کہ پرتو شرر کا ہے

پتھر گواہی دینے لگے ہیں وجود کی
یہ فیض، یہ جمال اُسی دیدہ ور کا ہے

ملتا ہے لہر لہر ہواؤں میں اُس کا عکس
شاید یہ معجزہ بھی مرے بال و پر کا ہے

ویراں زمیں پہ رنگوں بھری چادریں بچھیں
سورج نہیں، غبار مرے اُجڑے گھر کا ہے

اب باہُنر کی موت کا ماتم نہیں کہیں
یہ قہر زا غرور کسی بے ہُنر کا ہے

ذرّوں کی بات ہوتی، کوئی حل نکالتے
سُلجھائے کون مسئلہ شمس و قمر کا ہے

پھر مجھ کو ہے خیال مری سجدہ گاہ کا
پھر سامنے سوال ترے سنگِ در کا ہے

مجھ کو قیام راس نہ آئے گا عُمر بھر
منسوب میری ذات سے نقشہ سفر کا ہے

لوگ اپنے ٹھکانے بدلتے رہے
ہم کہ اپنے ہی رستے پہ چلتے رہے

جذب ہوتے رہے اپنی ہی خاک میں
اس طرح ہم بھی رنگوں میں ڈھلتے رہے

یہ مرے لب نہیں وقت کی آگ ہے
مئے کے ہمراہ ساغر بدلتے رہے

یہ کہاں غم کے گھر میں دھواں بھر گیا؟
اُن کے الفاظ خوشبو اُگلتے رہے

پاس میں ایک بھی نقش بگڑا نہ تھا
اُس کی چھاؤں میں غم تِلملاتے رہے

عزم کی آنچ پھیلی تھی چاروں طرف
حادثے آپ ہی آپ ٹلتے رہے

اُن کے پتّوں کا حق بھی نہ ہم دے سکے
جن درختوں کے سائے میں پلتے رہے

پیاس لکھدی گئی اپنے ہونٹوں کے نام
اُن کی ٹھوکر سے چشمے اُبلتے رہے

دھوپ تو آج اُن سے بہت دور تھی
پیڑ کیوں اپنے سائے میں جلتے رہے

دھوپ میں چل رہا ہوں سایہ بن
مَیں اگر راکھ ہوں تو شعلہ بن

پیڑ ہنستی رُتوں سے ہیں محروم
خوشبوؤں کا چمکتا غنچہ بن

رات گہری ہے راستہ ویراں
ہمقدم روشنی کا ہالہ بن

کاسۂ گُل اگر ہوں قطرہ دے
مَیں ہوں صحرا اگر تو دریا بن

ڈس رہی ہے نظر کو ویرانی
جلتی رُت میں مہکتا سبزہ بن

مرثیہ پڑھ رہے ہیں آئینے
جس کو چہرہ کہیں وہ چہرہ بن

منجمد خوں میں برق لہرائے
ایسا احساس ایسا نغمہ بن

راستے پیرہن بدلنے لگیں
ایسی منزل کا پیش خیمہ بن

غیر سے آس کیوں ہے قطرے کی
تجھ میں دریا چھپے ہیں اپنا بن

ظرف کو آزما کے دیکھ لیا
سب کو دل میں بٹھا کے دیکھ لیا

کوئی اپنا نہیں مصیبت میں
سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

پھر وہی آرزو وہی چاہت
خود سے پیچھا چھڑا کے دیکھ لیا

آنسوؤں کا خلا نہیں بھرتا
بارہا مسکرا کے دیکھ لیا

لوگ سنتے ہیں کچھ نہیں کرتے
اپنا دکھڑا سنا کے دیکھ لیا

اک خلش پھر بھی رہ گئی باقی
پاس جو تھا لٹا کے دیکھ لیا

زندگی کا سرا نہیں ملتا
ہم نے خود کو گنوا کے دیکھ لیا

ہم ہی معتوب ہم ہی دیوانے
بار سب کا اٹھا کے دیکھ لیا

لوگ چہرہ بدل کے ملتے ہیں
آئینوں میں سجا کے دیکھ لیا

آنسوؤں کو جلانے نکلا ہوں
مَیں نیا گھر بنانے نکلا ہوں

کوئی سورج اگر ہے ساتھ رہے
ظلمتوں کو مٹانے نکلا ہوں

برف کھانے لگی ہے بازو کو
دل میں شعلہ جگانے نکلا ہوں

جانتا ہوں عتاب آئے گا
حوصلوں کو بڑھانے نکلا ہوں

اپنے انجام کی نہیں پروا
بوجھ سب کا اُٹھانے نکلا ہوں

پیڑ چکھ لیں مزہ روانی کا
میں جڑوں کو ہلانے نکلا ہوں

شہر کو روشنی دکھانی ہے
اپنے ہی گھر کو ڈھانے نکلا ہوں

اُن کے آئینۂ تبسُّم میں
اپنے غم کو سجانے نکلا ہوں

لے کے آنکھوں میں صبح کا تارا
شام کا گھر بسانے نکلا ہوں

یہ جہاں جب تک محبّت کا جہاں ہوتا نہیں
آسماں سے مطمئن خود آسماں ہوتا نہیں

جب اندھیرا شدّتیں کرتا ہے اپنی اختیار
جگنوؤں کی بھیڑ سے روشن مکاں ہوتا نہیں

خون کی غوّاصیوں کا تبصرہ سچّا، مگر
رازِ ہستی ہر کسی پہ تو عیاں ہوتا نہیں

کیا کہے گی مجھ سے منزل اپنی گہرائی کی بات
مجھ سے اپنے راستے کا دکھ نہاں ہوتا نہیں

بات ہی رہتی ہے کچھ ایسی کہ بڑھتا ہے تناؤ
آدمی یوں ہی کسی سے بدگماں ہوتا نہیں

اشکِ غم ہوں مجھ میں رکھ اپنی حقیقت کا بیاں
مجھ سے افسانوں کا افسانہ بیاں ہوتا نہیں

درد اک اک حرف کو دے اپنی چمکیلی تراش
مضمحل عنوان زیبِ داستاں ہوتا نہیں

بکھر رہا ہوں قطرہ قطرہ جیسے رتوں کا رنگ روپ
دیکھنا ہے کیسے قطرہ بیکراں ہوتا نہیں

بھیگتی پلکوں کا شعلہ ہے دعاؤں میں شریک
میرا مالک اور مجھ پر مہرباں ہوتا نہیں

نہ وہ رنگینیاں غم کی نہ وہ خوشیوں کا پھیرا ہے
گئے ہو جب سے تم اِس شہر میں سنّاٹا بستا ہے

مَیں جن تنہائیوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں
وہی تنہائیاں آباد ہو جائیں تو اچھّا ہے

شفقت چہرے سے پھُوٹی، آنکھ میں آنسُو اُمڈ آئے
کِسی نے پاس آکر جب ہمارا حال پُوچھا ہے

عیاں ہوتی ہے ویرانی ہرے منظر کے سینے سے
اُداسی کا کوئی لمحہ جہاں سر سے گزرتا ہے

تعلّق کوئی دنیا سے نہ پروا اپنی ہستی کی
اگر سوچا ہے کچھ، تو درد کے بارے میں سوچا ہے

اُسی کا ذکر ہونٹوں پر، اُسی کی یاد سینے میں
کسی نے ہم سا دیوانہ کہیں رستے میں دیکھا ہے

جہاں پر دعوئے خودسر جھکا لیتا ہے سر اپنا
وفا کی اُس ڈگر سے بھی گزرنے کا ارادہ ہے

تمہارے لوٹ آنے کی کوئی صورت نہیں لیکن
نہ جانے کیوں یہ گھر ابتک تمہاری راہ تکتا ہے

قدم کی آہٹوں سے روشنی شاید کوئی پھوٹے
ابھی تنہائیوں میں دُور تک اپنی، اندھیرا ہے

خود سے بچھڑ گئے تو جہاں بھی جہاں نہ تھا
یہ وہ مقام تھا کہ مکاں بھی مکاں نہ تھا

وہ دشت میرے ذوقِ سفر کو دیا گیا
جس میں کسی قدم کا کہیں کچھ نشاں نہ تھا

دُنیا فریب دیتی ہے اس کا تو تھا یقیں
تم بھی فریب دو گے مجھے یہ گماں نہ تھا

کیوں مجھ سے دل کی بات چھپائی گئی وہاں
جب فاصلہ تمہارے مرے درمیاں نہ تھا

کیوں گفتگو کے بیچ تمہیں خوف سا لگا
وہ بھی زمین ہی تھی کوئی آسماں نہ تھا

لوٹ آئے اپنی ذات کے خاموش دشت میں
کیا رہتے اُس جگہ جہاں شورِ فغاں نہ تھا

ہر چیز بے نظیر تھی اُس شہر کی مگر
اک آدمی ہمارے طرح کا وہاں نہ تھا

اتنے کلیم ساتھ میں لیکر چلا تھا طورؔ
گو نگے تھے یوں کہ کوئی مرا ہمزباں نہ تھا

رِستے کے زخم زخم میں اُتری تھی میری ذات
اِس درد میں شریک کوئی کارواں نہ تھا

بادِ چمن سے دُور خزاں پر گُزر کیا
یوں ہم نے اپنی ذات کا پورا سفر کیا

لکھنی تھی مُجھکو شہر کی تفسیرِ جانگداز
ویرانیوں کی بھیڑ سے اکثر حذر کیا

ہم خوشبوؤں کے باب میں خاموش کب رہے
چرچا تمہاری ذات کا اک اک نگر کیا

ایسے ہی کب ملی ہیں ہُنر کو تمازتیں
جاں سوزیٔ خلوص کو وقفِ ہُنر کیا

ہر آدمی فرشتہ تھا اُس شہرِ ناز کا
یہ ہم کہ اُس کو واقفِ حُسنِ بشر کیا

اُس شہر کی سمٹتی ہوا کو دعائیں دو
جس نے بنامِ درد ہمیں دربدر کیا

جُز راکھ اور کچھ بھی نہیں تھا مرا وجود
قربان اُس نظر کے مجھے بھی شرر کیا

کچھ فاصلوں نے اور بھی چمکا دیا مجھے
کچھ قربتوں نے تیری بہت ہی اثر کیا

اُس انجمن میں کوئی بھی پرساں نہ تھا مرا
یہ تم کہ احترام مرا اِس قدر کیا

سرابوں سے بغاوت کر رہا ہوں
مَیں دریا کی عبادت کر رہا ہوں

رموزِ ذات کھل جائیں گے مجھ پر
مَیں اپنی ہی اطاعت کر رہا ہوں

ابھی دریا کی سرداری کہاں ہے
کناروں پر حکومت کر رہا ہوں

کہاں فرصت کہ پھولوں سے کروں چھیڑ
صبا تیری ہی خدمت کر رہا ہوں

بُرا کیا ہے بتا اے بے ضمیری
اگر تیری تجارت کر رہا ہوں

یہی غم ہے کہ بے رنگی کو اپنی
سپُردِ رنگ و نکہت کر رہا ہوں

پرانی رہ گذارو! ساتھ دینا
لہو کو نذرِ جدّت کر رہا ہوں

مرے لفظوں کے سر دستار باندھو
فسانوں کو حقیقت کر رہا ہوں

یہی ہے آسمانوں کی شریعت
مَیں مٹّی سے محبت کر رہا ہوں

وہ غرقِ اُلفتِ دُنیا، مَیں غرقِ موجِ ہستی ہوں
چمکتی ریت کیا دیکھوں کہ مَیں خود پیاس اپنی ہوں

شکستہ دل کی حسرت شہر سے نسبت نہیں رکھتی
مَیں اپنے پر سمیٹے اپنے ویرانے میں رہتی ہوں

مری آنکھوں میں اب بھی ٹوٹی قبروں کے مناظر ہیں
مَیں گردِ بیکسی ہوں خیر کے رستے میں بکھری ہوں

اُجالا ہو کے تو اپنے ہی گھر میں قید ہے اب تک
مَیں ناقص رات پھر بھی غم کے عنوانوں میں بکھری ہوں

مَیں اپنے خوں کی لو تھی آندھیوں سے کس طرح بجھتی
سراپا موم کا پھر بھی نہ پگھلی ہوں نہ سہمی ہوں

مجھے ابرِ رواں خود اپنی آنکھوں میں بٹھائے گا
میں اپنے آنسوؤں کی چھاؤں میں پروردہ بجلی ہوں

ہراساں ناخنِ تدبیر بھی دیکھے گئے اکثر
گریزاں ہے جہاں جس سے میں وہ پیچیدہ گتھی ہوں

کفن غنچے کا، تن غنچے کا، پیراہن بھی غنچے کا
ہوا بردوش خوشبو ہوں سمٹتی ہوں بکھرتی ہوں

نیا ملبوس بخشا ہے مری فکروں نے لفظوں کو
نئے ہونٹوں کی جاں سوزی نئے لفظوں کی جھولی ہوں

جب سے غم معتبر ہُوا اپنا
ہے زبانوں پہ تذکرہ اپنا

اِس طرح اپنا راستہ چلئے
راستہ دیکھے راستہ اپنا

پاؤں سوچ کے گھر میں رکھنا ہے
منفرد سب سے حوصلہ اپنا

غیر کی سمت آنکھ کیا اُٹھتی
اپنا سایہ نہیں رہا اپنا

آگے ملتے ہیں آسماں اب تو
دُور پہنچا ہے سلسلہ اپنا

قربتوں کے لئے ضروری ہے
بھول جانا کہا سنا اپنا

ہم نے کب آپ کی شکایت کی
اپنے ہونٹوں پہ ہے گلہ اپنا

اپنی اپنی کہی ہے لوگوں نے
اُس میں کب کوئی عکس تھا اپنا

ہم نے ہر زاویئے سے دیکھا ہے
تب اُسے راز داں کیا اپنا

سکوں غارت تو ہو گا آرزوؤں کی پرستش ہے
حقیقت کی زبوں حالی میں خوابوں کی پرستش ہے

ہمیں بھی راستہ مل جائے گا غم کے دھندلکوں میں
حصارِ زندگی اپنے ارادوں کی پرستش ہے

پرستش ہے یہ اُس کی، تازہ ہے جس کو پرستش پر
نہ سورج کی، نہ ہی یہ چاند تاروں کی پرستش ہے

غزل وہ اور ہو گی جس میں اُس کا نور شامل ہے
بنامِ فکروفن یہ بھی کتابوں کی پرستش ہے

کوئی موتی ہی ہاتھ آیا نہ لہروں کی گرہ سلجھی
سمندر چھوڑ کر جب سے حبابوں کی پرستش ہے

اُلٹ دیں گی نقابیں منزلیں خود اپنے چہرے سے
یہ منزل کی نہیں دلدار رستوں کی پرستش ہے

مکاں کی گھات میں ہوگا مکاں ہی میں اندھیرا بھی
مکانو، جاگتے رہنا چراغوں کی پرستش ہے

پرندوں کا لہو جمتے ہوئے دیکھو گے پتھر پر
پرندو، اتنی آساں کب ہواؤں کی پرستش ہے

سفر میں اپنی قیمت دھول سے بدتر ہوئی لیکن
خیال و خواب میں اب بھی گلابوں کی پرستش ہے

چراغوں کی لوؤں پر شوق اپنا گھر بنائے گا
جہاں جاؤ گے یہ سایہ تمہارے ساتھ جائے گا

اُسی کی خاکِ پا سے نُور کے چشمے رواں ہوں گے
اندھیری رات میں جو اپنی آنکھوں کو جلائے گا

نہ سُورج میں نمی ہوگی نہ گرمی چاند میں کوئی
اگر وہ روشنی کی ضد میں اشکوں کو بجھائے گا

گُلوں پہ کیا گُذر جائے گی روتی حسرتو پوچھو
کسی پتھر کے آگے جب وہ اپنا غم سنائے گا

ابھی اپنی انا کے دائرے میں مطمئن ہے وہ
پریشاں ہو کے اک دن تو ہمارے پاس آئے گا

زمیں نے رکھ دیا ہے قرض اُس پر بیتی نسلوں کا
اگر وہ نسلِ آدم سے ہے یہ قرضہ چکائے گا

وہ رکھ کر چاند کی اک ایک منزل پر نظر اپنی
خود اپنے خواب کا نقشہ بنائے گا مٹائے گا

اِسی ساحل پہ اپنا ڈوبنا اپنا اُبھرنا ہے
سمندر ایک دن ہم کو بھی سینے سے لگائے گا

ہمارے جسم پر بھی داغ ہیں اُس تپتے موسم کے
ہمارے نام بھی گُل کا کوئی پیغام آئے گا

وہ قطرے میں سمندر کو ڈبونا چاہتا ہے
ابھی شاید نہیں کچھ، کچھ تو ہونا چاہتا ہے

کھنک زنجیر کی کہتی ہے خوں آلود ذرّہ
فسونِ جبر سے آزاد ہونا چاہتا ہے

مجھے عرفان دے پہلے خود اپنی انجمن کا
اگر وہ مجھ میں یکتائی سمونا چاہتا ہے

کوئی دیوار ہو ٹکرا کے چکنا چور ہو گی
وہ اب مقصد کے پیچھے خود کو کھونا چاہتا ہے

زمیں اُس کو دعا دے تیری آبادی کی خاطر
کوئی دیوانہ اپنا خون بونا چاہتا ہے

ہماری جاگتی راتوں کا آخر کیا بنے گا
سحر، بیدار تن جو اور سونا چاہتا ہے

یہ وحشت ہے کہ تجدیدِ جراحت وقتِ نازک
لہو سے وہ لہو کا داغ دھونا چاہتا ہے

اُڑے تھے اِس سے پہلے بھی کئی پتّے ہوائیں
مرے انجام پر کیوں پیڑ رونا چاہتا ہے

فلک اپنے مہ و خورشید بھر اُس کے قدم میں
اگر ذرّہ زمیں کا بوجھ ڈھونا چاہتا ہے

مَیں سوچ رہا ہُوں غمِ تقدیر سے آگے
کہتے ہیں جسے زیست، ہے شمشیر سے آگے

زنداں کے اندھیروں میں کہاں اُسکا تماشا
دیوانگی جو رقص ہے زنجیر سے آگے

گُمنامی ریاضت کے لئے مکتبِ کامِل
شعلوں میں یہ وحشت کہاں تشہیر سے آگے

دنیا میں کہیں اُس کا ٹھکانہ نہ کوئی نقش
جو بستے گیا درد کی جاگیر سے آگے

کچھ خواب کہ تعبیر سے محروم رہے ہیں
کچھ خواب کہ چلتے رہے تعبیر سے آگے

اُس موڑ پہ اُٹھ جاتا ہے سورج کا یقیں بھی
ملتا ہے اندھیرا جہاں تنویر سے آگے

رعنائی نے یہ راز کیا فاش نظر پر
تصویر کا ہر راز ہے تصویر سے آگے

تقریر میں اظہار کا پھیلاؤ کہاں تھا
آباد خموشی ہوئی تقریر سے آگے

بکھرا ہے بشر جسم کے دوراہے پہ آ کر
پہچان بڑی سخت ہے تقصیر سے آگے

اگر انساں میں حُسنِ شہرِ انسانی نہیں ہوتا
کوئی صُورت ہو جینے کی وہ محمودی نہیں ہوتا

قصیدہ خواں رہی دنیا ہمیشہ کامرانی کی
یہاں کوئی کبھی غم خوارِ ناکامی نہیں ہوتا

یہی تو دیکھنا ہے ہم کو راتوں کی حکومت میں
اُجالا کیسے چاروں سمت پر حاوی نہیں ہوتا

طوافِ حرف بھی پیچ پیچ طوافِ مہر ہے لیکن
کسی صُورت بیاضِ شعر کی سُرخی نہیں ہوتا

ہماری آنکھ کے بادل ہی ہم کو سبز رکھتے ہیں
کسی دریا کے بل پر جسم ہریالی نہیں ہوتا

بڑھی ہے تیر کی پرواز سے پرواز اب اُسکی
پرندہ اِتنی آسانی سے اب زخمی نہیں ہوتا

وہی سورج کہ جس نے ٹھنڈکیں بخشی ہیں باطن کو
اُسی سے کیوں ہمارا درد مہتابی نہیں ہوتا

شہادت کی تڑپ نے ہونٹ اُسکے سی دیئے ہونگے
ہر اک چہرہ تو بزمِ مرثیہ خوانی نہیں ہوتا

یُوں ہی چپ چاپ اک اک قطرۂ خوں صرف کرنا ہے
مرا ویرانہ جبتک نازہ آبادی نہیں ہوتا

دانائیوں کے شہر سے آگے نکل گیا
نادان، کس کی چھاؤں میں اِتنا بدل گیا

روشن تھا کون آج چراغوں کے درمیاں
اُس انجمن میں موم سے پتھر پگھل گیا

کیا اُس سے ضبط ہو سکیں بڑی کامیابیاں
کم ظرف اِک ستارے پہ اِتنا اُچھل گیا

شکلیں بدل رہا ہے کھلونوں کی امتحاں
اک تو کہ چھوٹے بچوں کی صورت مچل گیا

نفی ضبط کی چٹان بھی اک بوجھ رُوح پر
مجبور ہو کے جوش کا دریا، اُبل گیا

اب آنسوؤں کی دھوپ میں گُل کی کشید کر
منڈلا رہا تھا سر پہ جو طوفان ٹل گیا

اک رُت تھی جبکی آگ کا چرچا تھا پات پات
اک پیڑ اپنے سائے میں چپ چاپ جل گیا

پُرشور ہو گیا تھا وہ دریا کے شور سے
قطرہ سکوتِ بحر سے کیسے بہل گیا

صدیوں کو اپنی ذات پہ شرمندگی ہوئی
صدیوں کو جب سمیٹے ہوئے ایک پل گیا

دھوپ ہلکی سی بھی سورج نہ اُتارے گھر میں
آج مہماں ہے کوئی چاند ہمارے گھر میں

رات کی مانگ دمکتی ہے سہاگن کی طرح
اپنے آنسو ہیں کہ اُترے ہیں ستارے گھر میں

وقت کی آگ کو سینے سے لگاتے ہم بھی
اپنا سایہ بھی اگر ہوتا تمہارے گھر میں

آدمی، اندھی ہواؤں کا سنگدل لشکر
وہ کوئی دیپ ہے جو عمر گذارے گھر میں

ہنستی آنکھوں کے اُفق ساون بن جاتے ہیں
رُوپ ایسا بھی دکھاتے ہیں نظارے گھر میں

اپنی تنہائی تھی، یہ رات تھی، سنّاٹا تھا
سیرِ آفاق ہوئی اُنکے سہارے گھر میں

سوکھے پتّوں سا ہواؤں میں بکھر جاتا ہے
آدمی لاکھ کوئی رنگ نکھارے گھر میں

ایسے انداز سے اک روز پکارو ہم کو
خود پلٹ جائیں تمنّاؤں کے دھارے گھر میں

تب بھی رستوں سے کوئی رشتہ بنا رہتا ہے
بیٹھ بھی جائے اگر کوئی کنارے گھر میں

بادلوں کو سہارا کہا تھا
پھر ہواؤں سے اک سامنا تھا

خوشبوؤں پر تسلّط جمایا
یوں ہوا کو مخاطب کیا تھا

آج بھی اُس کو ویسا ہی پایا
اُسکے بارے میں جیسا سُنا تھا

ذرّہ پہچان میں کیوں نہ آتا
سُورجوں کے مقابل کھڑا تھا

ہونٹ کیوں رُک گئے کہتے کہتے
وہ کوئی بات کہنے چلا تھا

بوڑھے پربت کے ہمراہ اک پیڑ
نور کی آس میں جھک گیا تھا

اُس نے آگے بڑھایا سفر کو
راستہ تو بہت تھک چکا تھا

پاؤں اُس کے زمیں پر تھے لیکن
آسمانوں پہ غم چل رہا تھا

کوئی منظر رہا ہے گفتگو میں
اپنی آنکھوں سے وہ دیکھتا تھا

صبح نے اپنا زرّیں آنچل سبزہ سبزہ لہرایا ہے
پھولوں سے کس طرح کہوں میں کس کا چہرہ یاد آیا ہے

سبز زمیں کا سونا چاندی، غم کی آنکھ کے ہیرے موتی
ہم نے دل کے ویرانے کو ذرّہ ذرّہ چمکایا ہے

گونگے، بہرے، اندھے ساحل، لہروں کی پتوار سنبھالے
ہم ہی پھیلے قطرہ قطرہ دریا جب جب بل کھایا ہے

ہجر کی جلتی فصل سے رشتہ جوڑنا سب کے بس میں کہاں تھا
وصل کی فصل اُگائی ہم نے جب جب یہ موسم آیا ہے

وقت کی گردش جسکے آگے بے بس تھی وہ اپنا غم تھا
ناز تھا سب کو جس سورج پر رستہ رستہ گھنایا ہے

تاج لوؤں کا سر پہ رکھ کے رقص کناں ہے ذرّہ ذرّہ
کس نے غم کو اپنا کہہ کر زرد رُتوں کو اپنایا ہے

اپنے ہاتھوں توڑ دیئے ہیں گھر میں رکھّے سارے کھلونے
یوں بھی ہم نے عُمر بسر کی یوں بھی دل کو بہلایا ہے

اُسکی زبانِ پروردہ پر مُہر لگا کر سچّائی کی
سکّوں کی جھنکار کو ہم نے اپنے راگ سے چونکایا ہے

دریا کی غوّاصی کے ہم دل سے رہے ہیں قائل لیکن
اپنی ذات کی غوّاصی میں لُطف انوکھا ہی پایا ہے

نشان اپنے قدم کے دلوں پہ چھوڑ گیا
وہ شخص ہم کو لہو کی رُتوں پہ چھوڑ گیا

شبوں کے سارے الم خود ہی سہہ لئے اُس نے
نئی سحر کو نئی راحتوں پہ چھوڑ گیا

لہو سے اپنے بجھاتا رہا وہ تیغ کی پیاس
ہر التفات مگر مہ وشوں پہ چھوڑ گیا

قدم سے پھوٹ رہی ہے نئی کرن پل پل
وہ ایسے رنگ نئے راستوں پہ چھوڑ گیا

بہار سونپ دی اُس نے طلب کے کاسوں کو
وقار اپنے لہو کا غموں پہ چھوڑ گیا

اُسے تو دُھن تھی فقط راستہ بنانے کی
جو تھک گئے تھے اُنہیں منزلوں پہ چھوڑ گیا

حصار توڑ کے نیندوں کا وہ سحر خُو گر
ہمیں بدن کی نئی کروٹوں پہ چھوڑ گیا

تمام قرض چُکائے تمام دُکھ بانٹے
وہ قرضِ ذات مگر دوستوں پہ چھوڑ گیا

گُلوں سے آس تھی اُسکو رفوئے دامن کی
قصاصِ زخم کا قصّہ گُلوں پہ چھوڑ گیا

جلتی رُتوں کا خوف نہ شب کا ہراس ہے
خوشبو کسی بدن کی مرے آس پاس ہے

دل کی اُداسیوں میں کبھی کام آئے گا
رہنے دو میرے پاس اُسے غم شناس ہے

کیا یاسیت جمائے گی اپنا کوئی قدم
وابستہ اپنے خون سے جب اپنی آس ہے

اپنے زمین و آسماں اِس میں اُتار دے
یہ قصرِ گُل نہیں مرے غم کی اساس ہے

جن کے ضمیر زندہ تھے وہ لوگ مر گئے
اب بے ضمیروں میں کِسے اپنا پاس ہے

کہتے ہیں زہر بھی کبھی بن جاتا ہے دوا
اب آس کا علاج کوئی ہے تو یاس ہے

اشکوں میں رنگ و نور نہ سینے میں وہ جلن
تم کیا گئے کہ سارا مکاں ہی اداس ہے

باطن کا اک دھواں بھی تو چہرے سے ہے عیاں
ہر چند اس کے ہونٹوں پہ حرفِ سپاس ہے

اس تشنگی کا بھید کسی پر نہ کھل سکا
مئے رکھ کے اپنے سینے میں پیاسا گلاس ہے

کسی نے ایسی بدبختی زمانے بھر میں دیکھی ہے
میں جس کی چھاؤں میں رکتا ہوں وہ دیوار جلتی ہے

وہ بادل غم کا بادل تھا سبھی کا دھیان تھا اُس کو
ترا گھر ہی نہیں بھیگا ہماری چھت بھی بھیگی ہے

کبھی دریا کی اک اک لہر پر قبضہ رہا اپنا
ہماری دسترس میں آج کنکر ہے نہ موتی ہے

رُتوں کی بے بسی پر آنکھ سے آنسو ٹپکتے ہیں
کچھ اس انداز سے اب کے زمیں کی مانگ اجڑی ہے

کوئی بیٹھے اگر چادر بچھائے اپنے سائے کی
یہ بستی اُس کو اپنے آنگنوں کی دھوپ دیتی ہے

یہ کیا موسم ہے کیا یہ غم ہے کوئی تو مجھ کو سمجھائے
گلوں کی صحبتوں میں بھی مری مسکان پھیکی ہے

کوئی تدبیر اپنی راہ سے آگے نہیں بڑھتی
بنائے کون یہ بگڑی اگر تقدیر روٹھی ہے

کوئی چہرہ نظر آتا نہیں پھر اپنے چہرے کا
ہماری پشت پر جب روشنی کی بھیڑ ہوتی ہے

دمکتے موسموں کی تیز بارش تھی کہ خنجر تھے
فقط تن ہی نہیں یارو، نظر بھی اپنی زخمی ہے

لہو سفر میں لہو کی سمتیں بدل چکی ہیں
نئی زمینیں نئے خزانے اُگل رہی ہیں

پُرانی آنکھوں سے میرے فن کو پرکھنے والو
ہماری نظمیں ہماری غزلیں بدل گئی ہیں

یہ موسموں کی ہمہ ہمی تھی نہ یہ تراشیں
ہوا سے پوچھو ہوائیں کیا گل کھلا رہی ہیں

قدم قدم پہ بدلتے دیکھا ہے موسموں کو
یہ حسرتیں ہیں جو قبر تک ساتھ میں چلی ہیں

ہمارے نغموں سے نُور اُتریگا پتھروں میں
کہ غم نے غم کی تمام سمتیں سمیٹ لی ہیں

انہیں جبینوں میں دیکھ لینا اُجالا اُن کا
وہ ساری صُبحیں جو شب سے ڈر کے چھپی ہوئی ہیں

نئے قدم ہیں نیا ہے رستہ نیا سفر ہے
بدلتی منزل کی لغزشیں بھی نئی نئی ہیں

جہاں پہنچ کر بکھر گیا ہے ہر ایک نُقطہ
زمانہ دیکھے مری لگا ہیں وہیں جمی ہیں

فسُردہ جسموں کی صحبتوں میں قرار کیسا
کہاں کا شعلہ یہاں تو سانسیں بُجھی بُجھی ہیں

آگ سینے میں رکھی، آنکھوں میں دریا اُس نے
گھر کو بخشا ہے بہت پیچیدہ رستہ اُس نے

دل سمجھتا ہے کسے ڈھونڈ رہی ہے وہ نظر
یہ الگ بات سبھی چہروں کو دیکھا اُس نے

اُس میں دنیا سے کوئی بات الگ ہی ہو گی،
چھوڑ کر سب کو اگر اُس کو ہی پوچھا اُس نے

گُل نہیں شعلے بھی کرتے ہیں تمنا اُس کی
ایسا اعزاز مرے درد کو بخشا اُس نے

نقشِ جاں کہہ کے سبھی لوگوں نے چُوما اُس کو
اِس سلیقے سے مرے غم کو تراشا اُس نے

اب اُسے ڈھونڈ مرے لفظوں کے آئینوں میں
مجھ کو سونپا ہے اگر اپنا سراپا اُس نے

چاند کے زخم، مکاں پانی کے، لب کے شعلے
ایک پیغام کئی رُوپ میں بھیجا اُس نے

جب بھی اِترائی زمیں اپنے کسی جوہر پر
نازِ جوہر کو بھی مٹی میں ملایا اُس نے

جن کی پرواز میں جذبہ تھا اُسے پانے کا
اُن پرندوں کو فلک اپنا دکھایا اُس نے

قتیلِ حُسن ہُوں مٹّی سے بھرپائی نہیں ہوگی
زمانے تیری چاہت میری انگنائی نہیں ہوگی

نہ نغمہ دل میں اُترے گا نہ نوحہ ذی اثر ہوگا
شریکِ غم اگر اشکوں کی تنہائی نہیں ہوگی

زمینوں کا نہیں یہ مسئلہ ہے دل کے بسنے کا
خس و خاشاک سے آباد تنہائی نہیں ہوگی

ضعیفی کی چھتوں کا بوجھ بھی ڈھوتی ہے کاندھوں پر
سفر کی روشنی پر کیسے برنائی نہیں ہوگی

لہُو کی رہنما جب تک رہے گی غیرت زندہ
کوئی صُورت ہو وہ جینے کی رسوائی نہیں ہوگی

وہ گُل ہوں، آگ ہو، دریا ہو، یا بستی سرابوں کی
ہمارے خواب کی تعبیر رہ جائی ہنہیں ہوگی

تمہاری سطح کو پڑھتے ہی اُس کی گہری آنکھوں نے
مرے غم کی حقیقت خود ہی سمجھائی ہنہیں ہوگی

سبھی کو نور بانٹا ہو گا اُس نے اپنے سینے کا
مرے در تک مگر وہ روشنی آئی ہنہیں ہوگی

سمندر اپنا اک اک راز میں اُن سے چھپاؤں گا
ترے قطروں میں جبتک میری گہرائی ہنہیں ہوگی

رسوائی کا خوف بھی کتنا گہرا ہے
آدمی اس کی پرچھائیں سے ڈرتا ہے

اس سے بڑی مجبوری کیا ہے زخموں کی
سب کو اپنے زخم چھپا کر جینا ہے

منظر کی گہرائی پڑھنی تھی دل کو
دل نے خود اپنے ہی اندر جھانکا ہے

جتنا بڑھ سکتا ہے بڑھاؤ اور اسے
تنگی کیسی ارمانوں کا رستہ ہے

اُس سے تنہا کیسے ملوں یہ فکر مجھے
ایک زمانہ آگے پیچھے چلتا ہے

کیسے سمیٹوں کرنوں، غم کے سورج کو
قطرہ قطرہ، دریا دریا پھیلا ہے

اُسکی کشش کے آگے بے بس سب کے قدم
اِک حد تک تو دل نے سب کو روکا ہے

اِتنے اندھیرے اُس نے بجھائے کچھ نہ ہوا
ایک اُجالا اب بھی گھر تک آتا ہے

اُسکے گھر کی روشنی اُسکے آنگن تک
میرا غم سارے عالم میں بِکھرا ہے

موت جب آئی زندگی دینے
ساری دُنیا اُٹھی خوشی دینے

شام جب پھیلتی ہے آنگن میں
کون آتا ہے روشنی دینے

دُور تک غم نہیں تھا آنکھوں میں
خواب پھر آ گئے نمی دینے

زرد ہوتی ہے جب قبائے شجر
کون اُٹھتا ہے تازگی دینے

یہ شریعت ہے زر پرستوں کی
در پہ آتے ہیں مفلسی دینے

جبرِ غالب ہے چار سمتوں پر
عدل اُٹھا ہے بے کلی دینے

سادگی عیب بن گئی ہے جہاں
تو وہاں پہنچا سادگی دینے

حرص سے کیسے باز آئے وہ
آگ بڑھتی ہے شعلگی دینے

چاندنی میں جھلس رہے ہیں پھول
کوئی سورج اُٹھے نمی دینے

یہ بھید چلتے ہوئے راستوں پہ کھلتا ہے
ہمارے سائے سے آگے بھی کوئی سایا ہے

ابھرتے پودو، انہیں آندھیوں کے رستے میں
گھنے درختوں کو ہم نے بکھرتے دیکھا ہے

ملی ہے جب بھی غمِ روزگار سے فرصت
نظر میں ذات کو رکھ کے جہاں پہ سوچا ہے

یہ کیسی آگ ہے بجھتی نہیں بجھانے سے
جہاں دگر کے بھی عاجز ہر ایک دریا ہے

زمانہ جس کے تصوّر سے کانپ اٹھتا تھا
اُسی اندھیرے میں کوئی چراغ جلتا ہے

کوئی تو بھید کھُلا ہوگا اُس کی ہستی پر
وہ آج ذات کے اندھے سفر سے لوٹا ہے

وہ آگ ہے کہ ٹھکانہ نہیں ہے پیڑوں کا
یہ معجزہ ہے اگر سبز کوئی پتّہ ہے

کوئی مقام، کوئی موڑ آئے رستے میں
تمہارا دھیان ہمیں ہر سفر میں رہتا ہے

وہ کوششوں میں ہُوا کامیاب صدفی صد
نتیجہ جس نے بھی اپنا خُدا پہ رکھّا ہے

ہر چند ہواؤں کے ہاتھوں بکھراؤ میں ہر شیرازہ ہے
پھر مجھ کو کتابِ ہستی کا اک بابِ درخشاں بننا ہے

یہ اپنے جنون و وحشت کا فیضان نہیں تو پھر کیا ہے
پھر وادی وادی مہکی ہے پھر پربت پربت چمکا ہے

جو اپنے لہو کی بوندوں پر کرتا ہے عمارت اپنی کھڑی
اُس ہاتھ کی مٹی سونا ہے، اُس ہاتھ کا کنکر موتی ہے

اک چاند وہیں سے اُبھرے گا یہ ابر ذرا سا چھٹ جائے
یَیں عکس اُبھرتی حسرت کا وہ رات کا اندھا رستہ ہے

دریا کو کہاں اتنی فرصت کچھ سوچے سفر سے ہٹ کر وہ
ساحل ہے سفر سے بیگانہ بکنے دو اُسے جو بکتا ہے

وہ اور ہیں جو دریا پی کر رکھیں گے زباں منہ سے باہر
ہم پاس قناعت رکھتے ہیں قطرہ بھی ہمیں اک دریا ہے

اب اُس کا پتہ ہاتھ آتا نہیں پھولوں سے بہت پوچھا اُس کو
جس آبلہ پا کو چُپ سادھے، صحرا سے گزرتے دیکھا ہے

ہم اپنی ہی چھت کے سائے میں جی لیں گے سکوں سے عمرِ رواں
اشکوں کی مہکتی چاندنی ہے، یادوں کا بھڑکتا شعلہ ہے

پیڑوں کی عطا سے کیا ہو گا، دھوپوں کی سزا سے کیا ہو گا
مطلوب ہے جو سایہ سب کو وہ سایہ ہمارا سایا ہے

چاندنی کا بُجھا ارادہ ہُوں
سُورجوں کے نگر میں رہتا ہُوں

میری پرچھائیں سے بھی دُور رہو
سُورجوں کا نیا اندھیرا ہوں

جس سے پتھّر کا گھر ہُوا روشن
مَیں اُسی پیڑ کا اُجالا ہُوں

اِک نیا بھیدؔ کھولتی ہے ہوا
مَیں ہواؤں میں جب بھی اُڑتا ہُوں

ایک رَو اپنی لہر میں ڈُوبی
مَیں نہ سیراب ہوں نہ پیاسا ہُوں

راستوں کو سکون ملتا ہے
مَیں مکانوں کا ایسا رستہ ہُوں

اُس بلندی سے جوڑنا ہے سفر
جس بلندی پہ جا کے ٹھہرا ہُوں

آسماں قدر کر کہ مَیں بھی تو
تیرے دامن کا اک ستارہ ہُوں

آفتابوں کی آنکھ کا پیارا
جلتی بجھتی زمیں کا ذرّہ ہُوں

آگ جب سے لگی ہے آنگن میں
سُرخیاں بھر رہا ہُوں دامن میں

نُور ہی نُور اُس کا چہرہ ہے
عکس ٹھہرے گا کیسے درپن میں

آسماں بن گئی کرن میری
اُس نے سُورج چھُپایا روزن میں

جاؤ اُس کے قریب بھی جاؤ
ہے یہ خوشبُو گلاب و سوسن میں

جن کی آہٹ سے گونجتا تھا جہاں
کیسے چُپ چُپ پڑے ہیں مدفن میں

کیا کھلے گا نہ یہ ہوا نہ تراش
تازہ غنچہ پُرانے گلشن میں

یہ تعلّق کی بے پناہی ہے
چھوڑ آئے اُسے بھی اُلجھن میں

آنکھوں سے خوشی ہوئی رُخصت
عُمر ہم نے گزاری اَن بَن میں

ساری دُنیا کا رُوپ دیکھا ہے
چین مِلتا ہے اپنے درشن میں

جُنوں نے جب سے پروں میں صبا کو باندھ لیا
جُنوں نے باغ سے عہدِ وفا کو باندھ لیا

اُسی کے شوخ اِشاروں پہ اب چلے گی ہوا
سفر، سفر ہے، سفر نے ہوا کو باندھ لیا

اُداسیاں کسے بھاتی ہیں اُن کے پیڑوں کی
مچلتے درد نے زخمِ حنا کو باندھ لیا

سکون پائے گی کس طرح آبلہ پائی
سُلگتے دشت، مہکتی ردا کو باندھ لیا

اثر دکھائے گا اپنا ضرور بابِ قبول
خلوصِ شوق نے دستِ دُعا کو باندھ لیا

سکوت اوڑھے ہوئے صف بہ صف کھڑے ہیں شجر
یوں موسموں نے ہوا کی، ہوا کو باندھ لیا

حیات بانٹ دی ہم نے ترستے رستوں میں
خود اپنی پُشت پہ بارِ قضا کو باندھ لیا

اُسے تو اپنے نگینے لہو میں جڑنے تھے
شعارِ معنیٰ نے حرف و صدا کو باندھ لیا

سفر طویل تھا، رختِ سفر ضروری تھا
قدم سے تیرے قدم کی ضیا کو باندھ لیا

جب سفر ہر ہر قدم پر روشنی پھیلائے گا
میرے گھر کا ہر اُجالا یاد اُس کو آئے گا

بھیگی برساتوں میں اک ایسا بھی موسم آئے گا
شبنمیں پوشاک میں شعلہ جھُلستا جائے گا

جیسے جیسے جذب ہوگا اُس میں مٹّی کا خلوص
وہ ستاروں کی چمک سے دُور ہوتا جائے گا

پانی پھر جائے گا راتوں کی اُمیدوں پر ہُوا
پھُول ہی جب صُبح کی آغوش میں مرجھائے گا

میری پلکوں کی منڈیروں پر ہیں روشن اب بھی دیپ
یہ اُجالا ہی اُسے میری طرف لوٹائے گا

مَیں تو اپنی دھُوپ میں بس جاؤں گی ویرانیو
چھاؤں کو ٹھُکرا کے وہ بھی ایکدن پچھتائے گا

جس نے سوُرج کی تمازت کو دِیا اشکوں کا نم
دیکھ لینا آگ بھی اک دن وہی برسائے گا

دھیرے دھیرے اِتنے غم بڑھ جائینگے اطراف کے
اپنی تنہائی میں بھی اِنساں نہ بسنے پائے گا

اِن لٹوں کی خوشبوؤں سے گہری اِنسبت ہے جِسے
اِن سے ہٹ کر چاند کی بارات میں گھبرائے گا

موجوں کی بھی چرب زبانی دیکھی ہے
اُس ساگر کی بات، مگر انہونی ہے

اُس گیانی کو پربت کی چوٹی سے اُتار
اُس کی آنکھ سے اوجھل غم کی بستی ہے

مل جاتی ہے اپنی تھاہ بھی آپ اُسے
ایسی ندی جو اپنی دُھن میں بہتی ہے

یاد کی آنکھوں میں ہے گہرا سنّاٹا
تارا تارا رات کی ڈولی اُٹھتی ہے

نرم سُروں میں غم کی نازک لہر کو پڑھ
نغمے کے پردے میں حیات روتی ہے

پھول ہی کیا اُس اُڑتے بھنور کی لَو میں
شبنم اوڑھے ہریالی بھی جلتی ہے

نور کے ہر پیکر میں بس کر دیکھ لیا
اُس کے بِنا ہر چاہ ہماری پھیکی ہے

ابر کی آنکھ سے کیسا آنسو ٹپکا آج
جنگل جنگل مورنی رقص میں ڈوبی ہے

سب آنکھوں میں آنسو دیکھ کے مجھکو لگا
میری بپتا جیسے سب کی بپتی ہے

آنکھ کے دریا، تن کے جنگل پیاسے ہیں
منظر اپنا درد سمیٹے ۔ بہتے ہیں

مَیں شہروں میں بس کر خود پیچیدہ ہُوا
تیرے گاؤں کے رستے اب بھی سیدھے ہیں

مجلس کی رنگینی ویراں لگتی ہے
تنہائی کے ایسے جلوے دیکھے ہیں

جلتے سورج ڈھونڈ نیا ہمراہی کوئی
شام ہوئی اب اپنے گھر ہم چلتے ہیں

تیرا چہرہ راہگذر کا جلتا چراغ
دُکھ سُکھ کے سب بھید یہیں پر کھلتے ہیں

دریا اپنے ساحل پر پھر اُن سے ملا
وہ سارے احباب جو مجھ سے بچھڑے ہیں

اب تو بھر دے میرا دامن بھی پھولوں سے
مَیں نے دُکھ کے سارے موسم جھیلے ہیں

تیری نفرت ہے، یا میری جھوٹی اَنا
جانے رستے انجانے سے لگتے ہیں

اپنے گاؤں سے دُور بسے ہیں ہم لیکن
اُسکے سپنے، اب بھی اپنے سپنے ہیں

منافق راستوں کی سرپرستی منزلوں نے کی
محبّت کب ترے پیاروں کی قیمت بستیوں نے کی

کبھی شہروں کی تہذیبوں سے غم نے روشنی پائی
کبھی یُوں بھی ہوا ہے رہبری اِن جنگلوں نے کی

بسیں گے کیسے ویرانے، سجیں گے کیسے دیوانے
اگر پرہیز اپنے فرض سے دل داریوں نے کی

اُسے کیسے بھلائیں دُشمنوں کے دوست بن کر بھی
وہ گہری دُشمنی جو ہم سے اپنے دوستوں نے کی

سُلگتے دشت کی آنکھوں میں اُس کا عکس ہے اب تک
زمیں کی پیاس سے جو چھیڑ اُڑتے بادلوں نے کی

کتابوں کے ورق اُلٹے کبھی خود سے اُلجھ بیٹھے
سکوں کے ساتھ کیسی گھات ہنستے منظروں نے کی

زمیں سے رنگ پھوٹے، لہلہائی فصل حرفوں کی
اک ایسی آگ روشن اپنے دل میں بارشوں نے کی

وہ رستے کانچ کے تھے، تھا بہت خطرہ پھسلنے کا
قیادت آگ کی اچھا ہُوا خود آنسوؤں نے کی

وہی پھیلا رہا ہے اپنا اندھیارا اُجالوں میں
دُعائیں جس کی خاطر مندروں نے مسجدوں نے کی

روشنی بے نشاں ہے رستوں میں
کیا جلے گا لہو چراغوں میں

کیسے منظر میں رنگ اُتریں گے
دُھول لفظوں میں دھول سوچوں میں

کون پُوچھے گا دردِ شبنم کا
چار سُو آگ ہے دماغوں میں

آئینہ آئینہ اُداسی ہے
وہ تمازت نہیں ہے چہروں میں

سُورج اپنے سفر سے بیگانہ
رات اُلجھی ہُوئی ستاروں میں

جوڑ دے جو پیڑوں کو شاخوں سے
اب وہ خوشبو نہیں ہے پھولوں میں

وقت کے ساتھ بٹ گئے ہم بھی
آڑی، ترچھی، کھڑی لکیروں میں

بیل کو اپنے تن کی حیرانی
چاند سہما ہوا دریچوں میں

پانیوں کے سفر پہ کیا نکلیں
آگ روشن نہیں ہے سینوں میں

زخم کا حساب کرنے بیٹھے ہیں
غم کو بے نقاب کرنے بیٹھے ہیں

جسم کی فصیل ٹوٹتی نہیں
عمر نذرِ خواب کرنے بیٹھے ہیں

آسماں سے جو بھی اب عذاب آئے
ریت کو گلاب کرنے بیٹھے ہیں

آپ، سب کی زندگی ہے اور ہم
آب کو سراب کرنے بیٹھے ہیں

سورجوں کو قلب میں اُتار کر
شب کو بے حجاب کرنے بیٹھے ہیں

منزلوں کو پا کے جو بھٹک گئے
راہ کو خراب کرنے بیٹھے ہیں

لے کے موسموں کی باگ ہاتھ میں
آگ کو سحاب کرنے بیٹھے ہیں

کشتیاں اُلجھ رہی ہیں بحر سے
بحر کو حُباب کرنے بیٹھے ہیں

اب تو روشنی سے ہمکنار کر
رُوح سے خطاب کرنے بیٹھے ہیں

رِشتوں کے بدلنے کی سزا اور ہی کچھ ہے
مٹنے میں اُبھرنے کی ادا اور ہی کچھ ہے

پھولوں بھرے ہر رنگ کے موسم سے ملے ہم
وحشت، ترے قدموں کی ہوا اور ہی کچھ ہے

راکھ ہونا کسی اور کو گُل دینے کی خاطر
اِس آگ میں جلنے کا مزا اور ہی کچھ ہے

سُورج ترے جلوے بھی گُھر بار ہیں لیکن
اُس چاند کے اشکوں کی ضیا اور ہی کچھ ہے

زخموں کی ہے معراج کہ اُس پھول کی پُرسش
اِس بار ہوا، بوئے حِنا اور ہی کچھ ہے

برسات سے کچھ دُور ہوئے جب تو یہ جانا
جلتے ہوئے ہونٹوں کی دُعا اور ہی کچھ ہے

بادل کے سُلگ اُٹھنے کا منظر ہے نظر میں
شبنم ترے شعلوں کی رِدا اور ہی کچھ ہے

گلیوں میں فقیروں کا کہیں نام نہیں ہے
اب کے ترے کُوچے کی صدا اور ہی کچھ ہے

ہوتی ہی نہیں ختم کبھی عمر کے ہاتھوں
اُس شوخ کے ہاتھوں کی عطا اور ہی کچھ ہے

یہ کم نہیں کہ پیڑوں کو گلنار کر گئے
صدیوں کا بوجھ ڈھونے چلے تھے بکھر گئے

کب پھول تک گئے ہیں مرے خوں کی راہ سے
جو میرے سر پہ گرد کا الزام دھر گئے

ساحل پہ کیسے رکتے کہ موتی کی پیاس تھی
گہرے سمندروں کی تہوں میں اتر گئے

جب آنکھ ہی میں حسن نہیں، حسن پھر کہاں
پتھر کے ساتھ رہنے میں آئینے مر گئے

بینائیوں کے قحط کا رونا تھا ہر طرف
ہم سر جھکائے راہ سے اپنی گزر گئے

قدموں کو آج دھوپوں نے بوسہ دیا ہے پھر
سایہ نوازِ محسن و ہمدم کدھر گئے

اپنے ہی گھونسلوں میں ہوئیں قید آندھیاں
ہم اپنے خوں کی گرمیاں لے کر جدھر گئے

یُوں حال، غمگسار ہوا اپنے حال کا
ماضی کے جتنے زخم تھے سینے میں بھر گئے

جگنو بکھر گئے ہیں ہواؤں کے دوش پر
لہرائے آنچلوں کو جہاں ہم بکھر گئے

کتابوں کے سفینے غرق ہوتے دیکھتا ہُوں مَیں
سمندر اپنے حرفوں کا اُبلتا حوصلہ ہُوں مَیں

زمانہ مجھ کو اپنا لے، کہاں یہ حوصلہ اُسمیں
کہ اپنی آگ میں کھلتا انوکھا راستہ ہُوں مَیں

اِسی میں آنے والی منزلوں کے راز ہیں پنہاں
بزرگوں کے قدم کا ایک روشن نقشِ پا ہُوں مَیں

مزے مجھ کو ملے دشت و چمن کی سینہ چاکی میں
طلب جس کی نیا شعلہ وہی اندھی ہوا ہُوں مَیں

گھنے جنگل کو پہناؤ، کہ ویرانیٔ صحرا کو
سبھی کے تن پہ جو آجائے گی ایسی قبا ہُوں مَیں

یہیں تم کو ملیں گے پھول کے گھونگھٹ جبینوں پر
سُلگتے دشت میں اب بھی گزرگاہِ صبا ہوں میں

نقوشِ انجمن طے کر نہ پائیں گے جسے جلدی
اک ایسی گرمِ تنہائی کا بڑھتا فاصلہ ہوں میں

خود اپنی ذات میں ڈوبا تو ہاتھ آیا پتہ اُس کا
اُسے تو پالیا ہے غم نے لیکن کھو گیا ہوں میں

درختوں نے بچھائے اپنے سائے میرے قدموں میں
جہاں بھی دھوپ سے لڑنے کہیں تنہا کھڑا ہوں میں

ہواؤں میں اڑتے پتّوں کا کہاں کوئی ٹھکانہ ہے
شجر پر لوٹ آنا، چاند مٹّی سے اُگانا ہے

کوئی پُرساں نہیں جلتی ہوئی ارماں کی فصلوں کا
بدن پر آگ اوڑھے کھیت کو آنسو بہانا ہے

لٹوں کی چھاؤں بن جائے محافظ جلتے رستوں کی
سُلگتی رہگذاروں میں اک ایسا گھر بنانا ہے

اگر روشن نہیں ہے ہاتھ چُپ رہنا بہت اچھّا
شبوں پر گفتگو کرنا، پریشانی بڑھانا ہے

مقدّر ہے الگ ہو کر کوئی سوچے تو کیا سوچے
کبھی سُورج کبھی ذرّے کے آگے سر جُھکانا ہے

ہوس نے اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے عالم کو
بہت مشکل ابھی انسان کا بسنا، بسانا ہے

پتہ کچھ تو چلے پیڑوں کو حدِ شہریاری کا
ہواؤں کے اشاروں پر کہاں تک سر ہلانا ہے

اُگل دے اپنے موتی خود سمندر آنچ سے ڈر کر
ہمیں اب سیپیوں کے تن میں وہ شعلہ چھپانا ہے

بدن شاداب ہیں پھیلا ہے لیکن سوگ روحوں میں
الگ اپنی زبوں حالی، الگ اپنا زمانہ ہے

رواں چاند ہے، نیلگوں دھاریوں میں
کوئی غم چھپائے کھڑا ہے چھتوں میں

مہکتے رہے اُس کے جوڑے میں گجرے
دھنک سر پٹکتی رہی بادلوں میں

کوئی گھر سے باہر نکلتا نہیں ہے
یہ کس کی مہک بس گئی روزنوں میں

اُسی کے بدن سے ہے راتوں میں مستی
وہی ایک چہرہ ہے روشن لوؤں میں

جہاں کل تھی منزل وہیں آج بھی ہے
مسافر بکھرتا گیا راستوں میں

مرے ساتھ دیوار و در جاگتے ہیں
عجب روشنی ہے تری آہٹوں میں

وہی اشک سے پہنچی شہنائیوں تک
جو ہے اک کسک غمزدہ پائلوں میں

گھنی بارشوں میں نہاتا ہے سورج
ترا عکس اُترے اگر دریچوں میں

اُسے پھول کی چھاؤں سے دور رکھنا
اگر رو پڑے کوئی ہنستی رُتوں میں

پلکیں جھکائے رات بہت دُور تک گئی
پھر اپنے غم کی بات بہت دُور تک گئی

رستے میں ساتھ چلتے ہوئے ہم بچھڑ گئے
گردِشکستِ ذات بہت دُور تک گئی

دیوانگی نے رُکنے سے اِنکار کر دیا
سمجھا نے کائنات بہت دُور تک گئی

وہ آگ میں کھلاتا رہا زندگی کے پھول
خوشبو بھی اُسکے ساتھ بہت دُور تک گئی

پہناتا کون آگ کے پیروں میں بیڑیاں
ہر رسمِ احتیاط بہت دُور تک گئی

ویرانیوں کے تن میں اُترنا بہت کٹھن
رنگوں بھری حیات بہت دُور تک گئی

وہ آسماں سرشت زمیں پر نہ آسکا
لُٹتے ہوئے برات بہت دُور تک گئی

اپنے ہی گھر کو لوٹنا مُشکل ہوا ہمیں
تحقیقِ ممکنات بہت دُور تک گئی

شمعوں نے بُجھ کے آنکھ سے پردہ اُٹھا دیا
حسرت پئے ثبات بہت دُور تک گئی

غم کدے سجنے لگے رات کی پہنائی میں
کون مہماں ہُوا رُوٹھی ہوئی تنہائی میں

یہ تصوّر ہے کہ اُترا ہے لبِ بام وہ چاند
روشنی دُور تلک پھیلی ہے انگنائی میں

آگ شبنم کے دریچوں میں بھی لگ سکتی ہے
جلتے احساس کی چنگاری ہے پُروائی میں

قافلے پھُولوں کے برباد ہوئے ہیں لیکن
اب بھی آباد ہے دُنیا تری انگڑائی میں

نشّۂ جشنِ مسرّت کو کہاں ہوش اُن کا
وہ منڈیریں جو بجھیں ڈُوبتی شہنائی میں

مطمئن ہو گئے آئینوں میں بس کر دُنیا
ہم کہ مِٹتے ہی رہے جذبۂ یکتائی میں

سینۂ سنگ سے جو عرش بریں تک دیکھے
ایسا شعلہ ہے کہیں آج کی بینائی میں

ہاتھ آئی کوئی منزل نہ کھُلی راہگذر
کیا مِلا اُن کو مری ذات کی رُسوائی میں

پھُول تو پھول ہیں کانٹے بھی زیارت کو چلیں
اب وہ سودا بھی کہاں ہے ترے سودائی میں

نئی منزلوں کی چُبھن بڑھ گئی ہے
اندھیروں سے آگے کرن بڑھ گئی ہے

شراروں نے وہ بھید کھولے سفر کے
دِلوں میں سفر کی لگن بڑھ گئی ہے

مرے تازہ خوں کی حرارت اُنہیں دو
اگر راستوں میں تھکن بڑھ گئی ہے

مُسرّت قدم چُومنے آئے گی خود
ترا غم لئے انجمن بڑھ گئی ہے

تُجھے لفظ کو مَیں نے وہ روشنی دی
مرے فن تری قدرِ فن بڑھ گئی ہے

یقیناً کوئی پھول روندا گیا ہے
اگر بے کلئ چمن بڑھ گئی ہے

صبا نے کسی خار کو چھو لیا ہو گا
گلوں کی جبیں پر شکن بڑھ گئی ہے

لہو کی طلب میں یہ احساس رکھنا
ابھی قیمتِ ہر بدن بڑھ گئی ہے

کہاں تھک کے بیٹھی ہے وحشت خرامی
اگر حدِّ دشت و دمن بڑھ گئی ہے

سفر کو باندھ لیا ہم نے اپنے قدموں سے
ہماری منزلیں آگے بہت ہیں رستوں سے

حقیقتوں کے نگر تک رسائی جب نہ ہُوئی
شکستگی نے ملایا ہمیں بھی خوابوں سے

لُغت نویس ہے معنیٰ کی اُلجھنوں کا شکار
زباں کا کام لیا ہم نے سادہ لفظوں سے

وہ آفتابی قبائیں پہن کے نکلا تھا
بڑھی جو رات تو گھبرا گیا اندھیروں سے

چراغ اپنے سفر پر روانہ ہونے لگے
یہ بات کہہ دے وہ سوئی ہُوئی ہواؤں سے

برس رہی ہیں وہ آنکھیں کہ خوں ہوا میرا
ملی ہے دل کی لطافت سنہری دھوپوں سے

میں اپنا راستہ اپنے لہو سے سینچوں گا
مجھے کلام کیا بھٹکے ہوئے ستاروں سے

زمین بانٹ دے مجھ کو ہزار ٹکڑوں میں
رہے گا ربط مرا پھر بھی اُن نگاہوں سے

سُلگتی ریت میں کھلتے ہیں سوز و درد کے پھول
یہیں پہ کٹتے ہیں دریا ہماری موجوں سے

سمندروں میں اگر روشنی اُتر جائے
تہوں میں ڈوبا ہوا نقش بھی اُبھر جائے

اُٹھائے پیڑ کیوں احساں نہ کسی بھی موسم کا
جو جڑ سے لپٹی ہوئی خاک زخم بھر جائے

بہار اوڑھ کے بھی زردیاں نہیں چھپتیں
شگفتہ تن پہ اُداسی اگر بکھر جائے

مری تلاش ہی اُس مضطرب نظر کا سکوں
کسی بھی راہ گزر سے اگر گزر جائے

یہ عصر ریشمیں ہاتھوں سے کاٹتا ہے گلا
سلانے زخم بدن آدمی کدھر جائے

یہ صرف خول ہے چہرے کا اصل چہرہ نہیں
جو بے نقاب ہو چہرہ تو روح ڈر جائے

مرے لہو میں بھنور ہیں ابھی سیاہی کے
اُجالا ہو تو مری زندگی سنور جائے

نظر، فریبِ نظر ہے، نظر کا دعویٰ کیا
سراب، روکشِ دریا اگر ہو، مر جائے

ہماری راتوں سے وہ رات کچھ الگ ہے ضرور
جو روٹھتی ہے منانے اُسے سحر جائے

بس گئے پیڑ ہواؤں میں ٹھکانے کے لئے
صدیاں لگ جاتی ہیں پہچان بنانے کے لئے

پہلے سب خاک ہوئے خاک سے چلتا ہے پتہ
خاک سے رنگ بھرا نقش اٹھانے کے لئے

جز لہو اور یہاں کوئی وسیلہ ہی نہیں
سنگ کی گود میں اک فصل اگانے کے لئے

عصر سا خود بھی ہے کم ظرف پڑوسی میرا
میرے سائے میں بسے مجھ کو مٹانے کے لئے

راستہ روکے نہ دھوپوں میں بسائے مجھ کو
کیوں بضد سب اسی دیوار کو ڈھانے کے لئے

جلتی کرنوں سے کہو راستہ روکیں میرا
خوشبو ہوں میں اُسے جاتا ہوں منانے کے لئے

دھوپ کی اُس کو بھی پہچان ہے پہلے سایو
چھاؤں سے دُور رہا میرے جلانے کے لئے

میری جڑ کا اُسے اندازہ نہیں ہے شاید
دریا بے چین ہے تنکے کو بہانے کے لئے

چھت میں روزن ہے نہ دروازہ کھلا ہے گھر کا
کون آئے گا یہاں روشنی پانے کے لئے

وہ قافلۂ شوق چلا ہے مرے گھر سے
جس کا کوئی رشتہ نہیں محدود نظر سے

آہٹ کو دبانے کی مکاں سوچ رہے ہیں
رستوں کو خوشی یہ ہے کہ مجبور ہیں در سے

آغاز کے شیدائی تو سب لوگ ہیں لیکن
ہونٹوں کو سیئے بیٹھے ہیں انجام کے ڈر سے

طاقت ہے زمانے میں اگر روک لے ہم کو
ہم اب بھی گزرتے ہیں اُسی راہ گزر سے

تُو اپنی چمک اپنے اندھیروں کو نہیں پڑھ
رشتہ ہے مرے خون کا پتھر سے نہ گھر سے

اُن قدموں کے سائے سے شجر دُور ہی رکھنا
پیدا نہ ہُوا تازہ سفر جن کے سفر سے

اِن سرد جزیروں پہ گزر کیسے ہو میرا
اک آگ سی ہر وقت بندھی رہتی ہے پر سے

بادل نے تو جسموں کی ہری فصل جلائی
مایوس نہیں کوئی مگر دیدۂ تر سے

وہ شمع نظر جس سے منوّر ہے رگِ جاں
بھڑکے جو ہوا اور بھی لپٹے ہے شجر سے

اگر ہیں سنگ کیسے اِن میں آتشِ شرر نہیں
یہ برف زار پُلِ صراط تیشۂ نظر نہیں

حباب در حباب پڑھ سمندروں کے عکس کو
حباب میں جو غرق ہو نظر وہ معتبر نہیں

یہ کشتِ خوں ہے کیسے سونپ دوں زمینِ سنگ کو
دِلوں کے موسموں کی جِس کو آج بھی خبر نہیں

تم اپنے آئینوں سے لڑ پڑو گے، مَیں اگر کہوں
نظر کے مدّعی ہیں سب کوئی بھی دیدہ ور نہیں

وہ پیڑ مر گئے ہیں جن کو رہروؤں کی فکر تھی
وہ چھاؤں خواب ہو گئی شجر بھی اب شجر نہیں

جو پیٹ کاٹتے ہوں دُوسروں کا اپنی بھوک میں
ہزار باہُنر سہی، وُہ ہاتھ باہُنر نہیں

تمہاری چھاؤں، میری چھاؤں، ساتھ ساتھ چل سکے
تمہارے تنگ شہر میں ابھی وُہ رہ گزر نہیں

نہ جانے کب مکاں کی آگ راکھ کر دے خواب کو
رُکیں کسی بھی دَر پہ کیا کہ اعتبارِ دَر نہیں

بَدن کے ساتھ رُوح کا ہے اِتّفاق لازمی
ہزار کوئی ساتھ ہے وہ شرکتِ سفر نہیں

کس کو دل کے زخم دکھائے ساحل ساحل بکھری ریت
اپنے رنگ میں غرق تھا موسم دھوپ چڑھی تو جھلسی ریت

موتی سے لبریز سمندر، مَیں اک خالی سیپ
دعوے میرا، موج شکستہ، روتا ساحل ہنستی ریت

قطرہ قطرہ بوندوں کا الطاف و کرم کیا زخم بھرے
سر سے سمندر گزرے لیکن درد سے گھائل زخمی ریت

دریا زنجیریں پہنائے یا کشتی سا، ساتھ بہے
ساحل ساحل پھیلتی جائے، لمحہ لمحہ پیاسی ریت

طے کرتا تھا سارا سمندر اُس کو اپنی ہمت سے
موجوں کی اندھی شمشیریں کیا زخموں کو گنتی ریت

بے بس تن پر دھوپ کے تیزے، سایہ سایہ سوز و تپش
وحشی آندھی، بڑھتی رقابت، جھُلسی، سہمی، روئی ریت

وُہ پانی کی لہر نہیں تھی، درد کا کوئی شعلہ تھا
برق سا چمکا، پاس سے گزرا، رستہ رستہ پھیلی ریت

دریا سُورج ہاتھ میں لیکر نکلے، یہ بیگانی رہے
چاند اگر سینے میں اُترے تپ جاتی ہے ٹھنڈی ریت

اپنے بدن کی چادر سے میں کس کس تن کو ڈھانکوں گا
ننگا موسم، ننگی فصلیں، ننگا دریا، ننگی ریت

مٹی پریشاں، صاحبِ اعجاز کیا ہوئے
خود کار، خود نواز، خدا ساز کیا ہوئے

پھر جِسم جِسم آگ کا موسم ہے دُور تک
بادل نژاد شبنمیں دمساز کیا ہوئے

باطن کی نکتہ چینی پہ آمادہ ہے سمُوم
گُلنار موسموں کے وہ ہمراز کیا ہوئے

سنّاٹے ترجمانِ شعورِ حیات ہیں
زندانِ شہر، پیکرِ آواز کیا ہوئے

دستارِ علم و فضل کا ہر سر ہے مُدّعی
وُہ جاں گداز منصب و اعزاز کیا ہوئے

روشن ہُوا مکاں تو بجھے درد کے چراغ
زخموں کا کرب بانٹتے انداز کیا ہُوئے

جن کی شعاعِ فکر سے گُل رنگ تھی حیات
وُہ ہنستی رُت کے نقرئی غمّاز کیا ہُوئے

بارش، گھروں میں آگ لگا کر گزر گئی
راگوں کی فصل بوتے ہوئے ساز کیا ہُوئے

خونخوار دُشمنی پہ اُتر آئی ہے ہَوا
شہرِ سُخن میں فِکر کے دمساز کیا ہُوئے

ہرا نغمہ سُلگتی بارشوں میں
تغیّر چاہتا ہوں موسموں میں

وہ سبزہ تن اُسے کیا راکھ کا غم
ابھی بیٹھا کہاں ہے دل جلوں میں

فسادِ ذہن ہے یا نُدرتِ ہوش
تلاش مہر کرتا ہے شبوں میں

ستم یہ ہے اُجالوں کا پرستار
سکونت چاہتا ہے ظلمتوں میں

مَیں شہروں میں تو آکر بس گیا ہُوں
پھنسی ہے رُوح لیکن جنگلوں میں

ہزاروں چاند میرے دل کے اندر
وہی اندھیارا لیکن راستوں میں

سمندر کھو چکا ہے آب اپنی
کوئی طوفان آئے کشتیوں میں

نظر منبر سے ہٹتی جا رہی ہے
کجی سی آ گئی ہے کچھ صفوں میں

دھواں اٹھنے لگا بھیگی چھتوں سے
کوئی بیدار تن پہنچا گھروں میں

گونج کے آنگن میں سنّاٹا کھڑا ہے
اِس سے بڑھ کر زندگی کی موت کیا ہے

کیا پڑھوں پژمردہ چہروں کے حواشی
آئینوں پر گرد کا سایہ پڑا ہے

قُربتیں، چنگاریوں کا سرد موسم
زندگی اَفروز بڑھتا فاصلہ ہے

کتنی معنی انگیز ہے گہری خموشی
چیختے لفظوں سے اندازہ ہُوا ہے

اَپنے سائے سے رہائی کی تمنّا
پیڑ پر اب دھوپ کا عقدہ کھُلا ہے

منزلوں کی تمکنت بجھتے دیوں سی
راستہ آگے ہی بڑھتا جا رہا ہے

غار کے سینے سے اٹھتا ہے دھواں پھر
ظلمتوں میں پھر کوئی تارا اُبھرا ہے

ڈوبتی آنکھوں میں آتا ہے اُجالا
جب مسافر رات کا غم پوچھتا ہے

کون آیا تھا کوئی جانے گا کیسے
چپ ہوئی دستک تو دروازہ کھلا ہے

خیالِ یار کا رشتہ بڑا ہے
مَیں سو جاؤں تو نغمہ جاگتا ہے

قدم آگے بڑھا لے رہروِ شب
اندھیرے سے اُجالا پھوٹتا ہے

زمینِ درد میں جس کی جڑیں ہیں
وُہ مہکا پیڑ کب سُوکھا ہوا ہے

کہاں تک تم مرا چہرہ پڑھو گے
مرا ظاہر مرا باطن جُدا ہے

مَیں جس رستے پہ تنہا چل رہا ہوں
مجھے عرفاں ہے سر بھی مانگتا ہے

زمیں سے اُٹھ رہی ہے بھینی خوشبو
گُلِ تر کوئی دفنایا گیا ہے

مُعلّق ہوں ہواؤں میں ابھی تک
زمیں سے میرا رشتہ کٹ چکا ہے

کھلیں گے دھیرے دھیرے سارے پہلو
مُلاقاتوں کا بڑھتا سلسلہ ہے

مُسافر ہم سبھی دشتِ ہوس کے
کوئی اُلٹا کوئی سیدھا چلا ہے

طلسمِ شب سے رہائی کا خواب دیکھ کبھی
کھُلی ہے آنکھ، کھُلا آفتاب دیکھ کبھی

سمندروں کی مسافت تو خیر جو کچھ ہے
سمندروں کو نِگلتا حباب دیکھ کبھی

مکانِ صبح تو آراستہ ہے پھولوں سے
سرِ زوال، مہکتا گلاب دیکھ کبھی

شرار بجھنے لگے خوشبوؤں کی ٹھنڈک میں
سسک رہی ہے رگِ ماہتاب دیکھ کبھی

لہو کے نقش مٹانے پہ تُل گئی ہے ہوا
گداگریٔ عذاب و ثواب دیکھ کبھی

طوافِ چہرہ، غرض پوجتی عبادت میں
نظر پہ کیسے چڑھائے نقاب دیکھ کبھی

اندھیرا کہتے ہیں کس کو سمجھ میں آئے گا
رکھی ہے طاق پہ روشن کتاب دیکھ کبھی

خطیبِ وقت ہُوا مطمئن خطابت سے
سماعتوں میں کُھلا پیچ و تاب دیکھ کبھی

جو باگ تھامے ہوئے چل رہی ہے رستوں کی
ہے کوئی چھاؤں مرے ہمرکاب دیکھ کبھی

پیڑ کی مانند کیوں چپ چاپ کھڑا ہے راستہ
جب ہواؤں کی طرح بہتا رہا ہے راستہ

رک گیا میں تو رکا ہے یہ بھی غافل کی طرح
چل پڑا میں تو ستاروں سا چلا ہے راستہ

ہنس کے سہتا ہے مسافر کی ہر اک ٹھوکر کا زخم
شہرِ تسلیم و رضا کا سلسلہ ہے راستہ

جن کو منزل کی طلب ہے اپنی منزل ڈھونڈ لیں
راہرو ہم، اور اپنا مدّعا ہے راستہ

موسموں کے رنگ ہوں یا دھول وحشی وقت کی
پاؤں کی برنائیوں سے کب چھپا ہے راستہ

اَپنے اَپنے راستوں کی مَدح میں گم راستے
راستے کھو جائیں وہ ہم نے چُنا ہے راستہ

اِمتحاں رَہرو کا، اِس کے پیچ و خم، پست و بلند
سہل کب تھا، خارزاروں سے بھرا ہے راستہ

کس کے ہاتھوں میں سحر کی باگ ہوگی صُبحدم؟
رات کی تنہائیوں میں سوچتا ہے راستہ

ہمنوائی رہروِ منزل کی کرتا ہے مگر
گرُ ہی حد سے بڑھے تو ٹوکتا ہے راستہ

پھول اور تلوار کے مابین رقصاں زندگی
گاہ آبادی کا منظر، گاہ ویراں زندگی

روشنی کی جستجو بے چین رکھتی ہے اُسے
ظلمتوں کے پے بہ پے حملوں سے حیراں زندگی

دھوپ کا تحفہ اسے دے چھاؤں بوڑھے پیڑ کی
خوں میں تلواریں اُگیں تو ابر ساماں زندگی

مانگتی ہے زخمِ دل دانا ہوں کے شہر سے
ڈوبتے سورج میں ڈھونڈے صبح ناداں زندگی

- -

قطرہ قطرہ خوں میں ذوقِ پرفشانی کی جھلک
ہے قفس بنتی ہواؤں سے پریشاں زندگی

آئینوں کو دعوتِ نظارگی دیتی ہے جب
کھولتی ہے رہگذر پر زُلفِ پیچاں زندگی

آنسوؤں کی سیج سے لے جائے تیغِ حُسن تک
کب رہی ہے معرفت میں اِتنی آساں زندگی

جب ہوا لے سر دماغِ گرم خوں سے کوئی آگ
بھُول کیوں جاتی ہے سارے عہد وپیماں زندگی

اپنی عُریانی نے اِس کو اور عُریاں کر دیا
ورنہ پردہ داریٔ غم کی نگہباں زندگی

کاغذ کی ناؤ، آگ کا دریا، سفر اُداس
انجام پہ جو سوچ گئی، ہو گئی نظر اُداس

ظالم ہوا نے سب کو دیا برف کا کفن
گُل کی مہکتی ہنستی گلی میں شجر اُداس

تہذیب بے تخت، رنگ بدلتی ہوئی قبا
پتھر چُنیں گے تاج تو ہوں گے گُہر اُداس

سُورج کا غم کہوں کہ اِسے زخم چاند کا
رہنے لگی ہے شام و سحر چشمِ تر اُداس

کیا بادباں تھا، جس نے لکھا اِن کو گُل کدہ
مجھ کو تو لہر لہر ملے، بحر و بر اُداس

آذر کی بُت تراشی پہ نکتہ رکھا گیا
کیُوں کر نہ ہوگا تیشۂ برقِ نظر اُداس

اپنا ٹھکانہ خود ہی بدلتا رہا ہوں میں
کیوں ہو مرے سفر سے مرا ہمسفر اُداس

جس شاخ پر ہے گل کا بسیرا وہیں ہیں خار
رہنے لگا ہے اپنے ہی تن میں شجر اُداس

کتنے ہلال، بدرؔ کی منزل نہ پا سکے
ظاہر میں مسکرائی تھی شب تھی مگر اُداس

علامہ انجم فوقی بدایونی صاحب مدظلہٗ العالی کی ہندوستان ۔ آمد پر کہی گئی

ایک استقبالیہ غزل....... مُقیم اثر بیاولی

دمکتے غنچے، مہکتے رستے، رُوپہلی آنکھیں سفر سفر ہیں
وجُود اپنا سنبھالے رکھنا، نشیلی باتیں سفر سفر ہیں

اُداسیوں کی کہر بھی ملتی ہے کھلتی رُت کی تجلّیوں میں
وُہ سیپیں یادوں کے زخم سہتی اُداس راتیں سفر سفر ہیں

صراطِ غم پر بدل نہ جانا، ضرورتوں کے تقاضوں جیسا
یہ ہنستے موسم کو خوں رُلاتی، دہکتی چوٹیں سفر سفر ہیں

تمہاری آنکھوں کے سارے موتی سمیٹ لیں گی ہماری آنکھیں
ہماری فکروں کے پھیلے دامن، ہماری سانسیں سفر سفر ہیں

جو آئینہ ہو تو عکس اپنا سا کوئی اپنے قریب رکھو،
بچھڑتے رستوں کے غم میں ڈوبی مہیب شامیں سفر سفر ہیں

شبوں کی خلوت کو تن پہ اوڑھے کہیں بھی جاؤ نہ بچ سکو گے
ہماری شامیں سفر سفر ہیں، ہماری صُبحیں سفر سفر ہیں

جو آنکھ رکھتے ہو اپنے رُخ پر، سفر کے اک اک ورق کو پڑھنا
لہُو سے گھائل، لہُو میں ڈوبی، لہو کتابیں سفر سفر ہیں

رواں جو ہو گا سفینۂ دل، کھُلیں گے دریا کے بھید تُم پر
کہے گی خاموشی پانیوں کی، مچلتی لہریں سفر سفر ہیں

وُہ تیری آنکھوں کے سُرخ ڈورے جو دل کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں
اُنہیں سے جلتی لَویں ہیں روشن، اُنہیں سے شمعیں سفر سفر ہیں

اشکوں سے تبسم کے اُجالے نہ بجھیں گے
بارش جو گھنی ہوگی تو یہ اور بڑھیں گے

تم درد کی راہوں میں اندھیرے نہ بچھاؤ
ہنستے ہوئے چہروں کے نشاں مٹنے لگیں گے

یہ آگ تو پھولوں کے لئے نکہتِ جاں ہے
کھلنا ہے جنہیں آگ کے سائے میں کھلیں گے

ہر نقش تو بنتا نہیں عنوانِ دل و جاں
رستہ ہے تو قدموں کے کئی نقش بنیں گے

تنہائی سے گھبرا کے چلے آئے تھے تم تک
سوچا بھی نہ تھا یہ کہ تمہیں اور جلیں گے

آخر تو محبّت کا بھرم رکھنا ہے ہم کو
نفرت ہی سہی تجھ سے مگر ساتھ چلیں گے

ہو نیند تو خوابوں کا سہارا بھی بہت ہے
بیداری میں کیوں جلتی ہوئی چھت میں بسیں گے

صحرا ہی نہیں پھول جھلس جائیں گے غم میں
جس دن تری دیوار کے سائے سے اٹھیں گے

اس گہرے سمندر کی خموشی کو سمجھنے
ہم اپنی ہی آواز کی لہروں میں بسیں گے

ہوا فریبی نے پتھّر بنا دیا مُجھ کو
میں بجھ گیا تھا اُسی نے جلا دیا مجھ کو

سفر سفر تھا نئی خوشبوؤں کا جال بچھا
گُلوں کے رنگ نے گھر سے چھڑا دیا مجھ کو

وُہ خوش قبا تھا بدن کی گپھا میں کیا رہتا
گیا جہاں بھی وہاں کا پتہ دیا مجھ کو

مَیں چاہتا تھا کہ ٹھہروں کسی جگہ جم کر
ضرورتوں نے مگر پھر بہا دیا مجھ کو

یقین اور بھی شاداب ہو گیا میرا
جب اُس نے آگ میں پتّہ ہرا دیا مجھ کو

مَیں اُس کلیم کے قرباں جس کے ہونٹوں نے
ذرا سے لمس سے اپنے جلا دیا مجھ کو

مَیں یہ اُداس سفر کس طرح سے طے کرتا
اُسی نے رنگ کا رستہ سجھا دیا مجھ کو

ہوا ابھی میری مخالف رہی ہے رنگ کیسا
خزاں کی آنکھ تھی خالی کھلا دیا مجھ کو

بھلا ہو اُس کا کہ تصویر پہ کہہ کے اپنی مجھے
ہر اک مکان میں اُس نے سجا دیا مجھ کو

بارشِ اشک ہوئی ، شعلۂ گلزار سے کہدو کہ ملے
ناؤ دریا پہ کھڑی پیاسی ہے ، پتوار سے کہدو کہ ملے

ٹہنیاں سج گئیں دلہن کی طرح مانگ میں سیندور بھرے
جھلملاتی ہیں چراغوں کی لوئیں یار سے کہدو کہ ملے

عکس کی خوشبو سے تاروں کی لٹیں بکھری ہیں موسم ہے عجب
منتظر رات بھی ہے آئینہ رخسار سے کہدو کہ ملے

دل کوئی بیچنے نکلا ہے یہی سن کے چلے آئے ہیں ، ہم
جستجو ہم کو اسی شئے کی تھی ، بازار سے کہدو کہ ملے

تشنہ لب کوئی ملے ، پیاس بجھا دینا ہے مسلک اپنا
سر ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں ، تلوار سے کہدو کہ ملے

دل کی چوکھٹ پہ اندھیرا ہے، سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
سُونا سُونا ہے مکاں، پیکرِ انوار سے کہہ دو کہ ملے

بِکنے آئے تو خریدار دِکھائی نہیں دیتا کوئی
خود نِگر، نازشِ صد درہم و دینار سے کہہ دو کہ ملے

خاکسار آئے ہیں سینوں میں چھُپائے ہوئے افلاک اپنے
خول میں رقص کناں جذبۂ پندار سے کہہ دو کہ ملے

اُس کے جلوؤں کے تلاطُم سے ہے ویران زمیں بھی گلشن
دھُوپ سہتے ہوئے لفظوں کے پرستار سے کہہ دو کہ ملے

چاند بھی پُرسکون لگتا ہے
کون دل کے قریب بیٹھا ہے

مجلسوں سے گریز کرتا ہے
جس نے تنہائیوں کو پرکھا ہے

جو قریب آیا، جل گیا فوراً
اپنا سایہ بھی کوئی سایہ ہے

اور رشتوں سے پیار ہو کہ نہ ہو
دل کا رشتہ سبھی کو پیارا ہے

جگنوؤں کا ملال کیا ہو گا
جس نے سورج کو مرتے دیکھا ہے

لاکھ اَپنے مَکاں میں قید ہُوں مَیں
میرا غم چاندنی سا پھیلا ہے

آگے دریا بڑھے تو کیا ہو گا
ایک قطرے نے سب کو گھیرا ہے

آگ ہی آگ ہے بدن میرا
نورُ ہی نورُ میرا رستہ ہے

آنکھ اَپنے گہر لُٹاتی ہے
تب کوئی پھُول دل میں کھِلتا ہے

بجھا کر آگ کو تو آ گیا مَیں
اذاں کی چھاؤں میں مُرجھا گیا مَیں

خلوص و درد سے واقف ہوئے شیخ
مُنافق، مسجدمیں شرما گیا مَیں

مقام آدمیّت کا سمجھنا
بہت مشکل، مگر سمجھا گیا مَیں

بجُھے تھے سارے پتھّر راستے کے
شراروں کا سبق دُہرا گیا مَیں

مخالف تھے خداوندانِ خودسر
صفیں اُنکی اُلٹ کر آ گیا مَیں

چمکتا تھا مجھے اپنے لہو سے
خلوصِ مہر کو ٹھکرا گیا میں

سمندر سے تو میرا کچھ نہ بگڑا
مگر قطرے سے دھوکہ کھا گیا میں

اندھیروں نے جتائی اپنی عظمت
اُجالا بانٹنے جس جا گیا میں

ترے الفاظ اب تک گونجتے ہیں
بیاں سے اپنے پہچانا گیا میں

آئینے سے آئینہ ٹکرائے گا
پتھروں کا ایسا موسم آئے گا

دیکھنا ساحل کے ٹکڑے لہر لہر
جب سمندر موج میں لہرائے گا

جھوٹ پر ہے اُسکے جذبے کی اساس
سچ مقابل آئے تو گھبرائے گا

اوڑھ لی ہے بے ضمیری کی ردا
اپنی عریانی پہ کیا شرمائے گا

مل گئی شب کی امامت جب اُسے
سورجوں کے درمیاں کیوں آئے گا

راہ کو ٹھکرانے والا راہ میں
منزلوں کے بھید کیسے پائے گا

یہ ڈگر گھر سے گئی ہے قبر تک
جو بھی ہے بینا قدم اپنائے گا

چند لفظوں کی وراثت پا کے وہ
ہوش کس کو تھا کہ یوں اترائے گا

ہے اگر غواص اترے بحر میں
بحر کیا ہے خود پتہ چل جائے گا

ہمارے ہونٹوں سے رنگیں کہانیاں نہ گئیں
جلے مکان، شگفتہ بیانیاں نہ گئیں

چھتیں بھی جھکنے لگی تھیں ضعیف کمروں کی
جواں امنگوں کی شعلہ فشانیاں نہ گئیں

بہاؤ تھامے ہوئے تھی، ندی کی گہرائی
وہ لہر لہر ہمکتی جوانیاں نہ گئیں

زمیں جھلستی رہی موسموں کے کرب کے ساتھ
گلوں کے رخ سے مگر ضو فشانیاں نہ گئیں

تمہاری یاد کی بارش ہے دل کا آنگن ہے
ہمارے خوں سے مہکتی نشانیاں نہ گئیں

تمام شہر بدن میں سمٹ کے بیٹھ گیا
یہ ایک تم ہو کہ ایذا رسانیاں نہ گئیں

مَیں آئینے کی طرح تیرے سامنے آیا
ترے دماغ سے کیوں بدگمانیاں نہ گئیں

یہ شہرِ سنگ نہیں، شہرِ جوہرِ غم ہے
ابھی دلوں سے سخن کی گرانیاں نہ گئیں

ہزار پیڑوں نے بدلا ہے اپنا پیراہن
اے برگِ خشک تری بے امانیاں نہ گئیں

مہک رہے ہیں نگاہوں میں زندگی کے چاند
ابھی نہ دیں کوئی غم ہم کو بے دلی کے چاند

شبوں کے تن میں اُجالا ہمارے خوُں سے ہے
سمجھ کے بات کریں ہم سے، بے رُخی کے چاند

زمینِ درد پہ سجدوں کی بارشیں ہوں گی
بسے ہوُئے ہیں جبینوں میں بندگی کے چاند

گھنے سکُوت سے پھوُٹے گا اضطراب نیا
بچھیں گے تاروں میں جیسے ہی نغمگی کے چاند

اِس آسماں کی وراثت ہے ایک چاند فقط
کِسے خبر ہے کہ کتنے ہیں آدمی کے چاند

جھکے نہ کیوں مرا سر اُس کے در پہ صبح و مسا
وہ جس نے مجھ کو دیئے علم و آگہی کے چاند

فسردہ ہونٹ بدل جائیں گے گلابوں میں
تری چھتوں پہ جو اُتریں گے بے کلی کے چاند

یہ رات کیسے مرے غم کا مدعا ہو گی
منافقت کی روش، اور ہمدمی کے چاند

ہم اپنے دل کی اُداسی اُسی میں دھو لیں گے
پلک پلک ہیں ترے ہجر کی نمی کے چاند

دینا ہے تجھ کو کچھ اگر شعلوں بھری آواز دے
رنگوں بھرا احساس دے، غم کا نیا انداز دے

خوش رنگ منظر دیکھنے کی آس نے جھلسا دیا
ہیں گردِ راہِ بے نظر، بینائی کا اعزاز دے

اشکوں کی تحریریں پڑھے، دل کے اندھیروں میں بسے
دمساز ہو ہر سانس کا ایسا کوئی دمساز دے

ان پر گدازِ قلب کی رعنائیاں بھی کچھ کھلیں
پتھریلے سینوں کو کبھی مٹی کا سوز و ساز دے

اب آگ کی تختی پہ حرفِ حق لکھے برسات میں
پھولوں بھری اس بزم میں شبنم کو وہ اعجاز دے

قطرے کی تہہ داری پڑھوں، اتنی مجھے فرصت نہیں
دریا اُتارے آنکھ میں، ایسا کوئی غماز دے

آنسو ہوں یا حرفِ نوا، آئینے ہیں اظہار کے
رازوں کو پوشیدہ رکھے، ایسا کوئی ہمراز دے

چیونٹی کے پر سے فاصلے طے کیسے ہوں گے عرش کے
چنگاریوں کو آگ کر، غم کو پرِ شہباز دے

میں تن برہنہ، پا شکستہ، دھوپ کے نرغے میں ہوں
سایہ نہیں سایہ مرا، قصرِ نیاز و ناز دے

بچوں سے بوڑھوں کی کہانی سُنتا ہُوں
اپنے عصر کا رُوپ بدلتا لہجہ ہُوں

اِس کے اُکھڑ جانے کا بھی خطرہ ہے بہت
دھیرے چلیے، مَیں شیشے کا رستہ ہُوں

مِیر کے رسیا، غالب کے احباب سُنیں
مَیں مومن سا شہرِ غزل میں تنہا ہُوں

صحرا کا آوارہ بگولہ ہُوں، لیکن
پتّی پتّی باغ کے موتی چُنتا ہُوں

خاک کے سارے رشتوں سے وابستہ مَیں
بِندیا سا صندل کی جبیں پر چمکا ہُوں

مَیں ہی تیغ کے لب سے بہتی خون کی دھار
مَیں ہی عکس صفت شیشوں میں ڈھلتا ہوں

دریا ہوں کیوں زخموں سے بیگانہ رہوں
اپنے گڑھوں کو پاٹ کے آگے بڑھتا ہوں

سورج ہے تو اب میری کرنوں کو سمیٹ
ذرّہ ذرّہ، قطرہ قطرہ پھیلا ہوں

اب اُن کی پہچان نہ ہو گی کیوں مجھ کو
برسوں جن کے ساتھ گھروں میں کھیلا ہوں

دُور شہرت سے تھا جہاں اپنا
پھر بھی روشن رہا مکاں اپنا

بُجھ گیا وہ چراغ کے ہمراہ
کام کرتا رہا، دھُواں اپنا

بہتا دریا نہیں، سراب ہے وُہ
ہم نفس ٹھیک ہے گُماں اپنا

جتنے تارے تھے دن کی نذر ہوئے
جگمگاتا رہا نشاں اپنا

رُخ بدلتی ہوا کی فکر، کسے
جب تلک خوں ہے پاسباں اپنا

آج پھر وحشتوں نے ڈھونڈ لیا
ہنستا گھر، شہرِ بے اماں اپنا

کل تھے دونوں جہان قبضے میں
اب زمیں ہے نہ آسماں اپنا

گُل کی صُحبت میں ایک پل گزرا
ذِکر پہنچا کہاں کہاں اپنا

پھر بنے سر کے مدّعی ہم لوگ
وقت پھر لے گا امتحاں اپنا

یہ رات کی خاموش صدائیں کس کے لئے ہیں
یہ جلتے چراغوں کی لوئیں کس کے لئے ہیں

آنکھوں کی سُلگتی ہُوئی محرابوں کے اندر
تنہائی کے شاداب دھوئیں کس کے لئے ہیں

جب چاہ میں وہ یوسفِ کنعاں بھی نہیں ہے
پھر راہ میں یہ اندھے کنوئیں کس کے لئے ہیں

لہروں میں کوئی پھول کھِلا ہوگا یقیناً
یہ دِن کے بھنور، مہکی شبیں کس کے لئے ہیں

اُس چاند سے رشتہ تو نہیں صورتِ غم کا
چہرے پہ اُداسی کی ردائیں کس کے لئے ہیں

دریا تری گہرائی ہے موتی کا اشارہ
موتی جو نہیں اتنی تہیں کس کے لئے ہیں

جب پھول کی عظمت سے تجھے بیر نہیں ہے
شعلوں کا سفر جلتی رُتیں کس کے لئے ہیں

جب تُو نے ہمیں بخشی زمینوں کی خلافت
آزاد زمینوں پہ حدیں کس کے لئے ہیں

وُہ تیرا ہی پرتَو ہے بدن جس سے ہے زندہ
خوں ہوتے ہوئے پیاسی رگیں کس کے لئے ہیں

رہروؤں سے آگے آگے چل رہی ہے رہگذر
ہم بڑھے تو اور آگے بڑھ گئی ہے رہگذر

چاک کر دیتی ہے سینہ گھٹتی بڑھتی رات کا
جاگتے قدموں کے حق میں روشنی ہے رہگذر

پھول کی چاہت میں کوئی قافلہ آگے بڑھے
سایہ سایہ اپنی خوشبو بانٹتی ہے رہگذر

جس کی خاکِ پا میں سورج ہونے امکان کا
اُس مسافر کے قدم کو چومتی ہے رہگذر

اپنی ہی شاخوں کے تن میں جو سمٹ کر رہ گیا
اُس شجر کو کب پلٹ کر دیکھتی ہے رہگذر

ساتھ میرے کوئی آئے یا نہ آئے غم نہیں
خامشی سے ساتھ میرا دے رہی ہے رہگذر

جن کے سپنوں میں مکاں روپوش تھا وقتِ سفر
اُن کو داغِ وحشتِ غم کہہ چکی ہے رہگذر

اور کیا اُس کا تعارف اور کیا منزل کی دھن
سو گئے سارے مُسافر، چل رہی ہے رہگذر

دَم میں دَم جب تک ہے قدموں کا سفر جاری رہے
موت جسموں کی تھکن ہے، زندگی ہے رہگذر

رابطہ ٹوٹ گیا عرش سے دیوانوں کا
خواب، صحرا سے جُڑا اس طرح گلدانوں کا

ہُوں وہ آتشکدۂ غم کہ کِیا کرتا ہُوں
سونی آنکھوں سے بیاں جاگتے ارمانوں کا

مَیں نے تعمیر کے سَو رُوپ دِکھائے اُس کو
اُس نے جب ذِکر کیا مجھ سے بیابانوں کا

گُل مجھے دے کے وہ سمجھی کہ ہُوا فرض ادا
خاک کو علم نہیں ہے مِرے ارمانوں کا

وہ حقیقت تھا اِسی رُوپ میں مِل سکتا تھا
طرز اپنایا مگر اُس نے بھی افسانوں کا

پھول ہو، چاند ہو، تتلی ہو کہ رُکتی دھڑکن
ایک عنواں ہے وہی سینکڑوں عنوانوں کا

جب بھی یاد آئیں مجھے تیری غزالی آنکھیں
بھر گیا آنکھ میں نقشہ مری پیمانوں کا

حُسن لغزش ہے نہ اندیشۂ نادانی ہے
بار میں کیسے اُٹھا پاؤں گا فرزانوں کا

میرے افکار کو سینے سے لگائے گا ضرور
جو بھی دیکھے گا زمانہ نئے افسانوں کا

چاند اب اپنے ہی آنگن سے کوئی پیدا کرو
روشنی کو روشنی کے گھر کا دروازہ کرو

ابر کی خیرات سے بھرتا نہیں ہے پیٹ جب
پھینک دو کاسہ طلب کا اپنا قد اونچا کرو

کب تلک شبنم کے ہاتھوں غسل جلتی شاخ کا
خوں اگر ہے تن میں ، خوں سے پیڑ کو تازہ کرو

موسموں کو بھی تو عرفاں ہو تمہاری ذات کا
چاک داماں لو، کبھی تو چاک کا سودا کرو

جو کرن کی شکل میں کرتا رہا گل کا طواف
خوشبوؤں سا تم بھی تو اس کا کبھی پیچھا کرو

یہ بھی تو تہذیبِ ضبطِ غم نہیں کُوزہ گرو
قطرہ قطرہ، دریا دریا پیاس کو رُسوا کرو

عکس ہے تو اُس کا رشتہ آئینے سے آئے گا
قطرہ قطرہ اپنے خوں کو اور آئینہ کرو

چاند تاروں تک پہنچ کر رُک گئے کیسے قدم
جو پسِ پردہ ہے اک شعلہ اُسے جادہ کرو

آرزو کی تنگ دامانی نہیں زیبا تمھیں
جسم کی ویرانیوں کو اور تابندہ کرو

سمندر اپنی لہروں سے اگر نا آشنا ہے
کسی قطرے کی تہہ پانا سلگتا مرحلہ ہے

تعلق جب نہیں کیوں آگ اوڑھیں راستوں کی
ہمیں اب اپنا سایہ بھی کسی دیوار سا ہے

طواف بام و در سے کیا مکاں ہم پر کھلے گا
وہ اک رشتہ جو اندر کا تھا کب کا کٹ چکا ہے

کرشمہ ہے یہ بھیگی خوشبوؤں کا بھیگے منظر
کوئی اب اپنے ہی سائے میں تنہا جل رہا ہے

ابھر آئیگا اک اک نقش حسرت، دشت امکاں
قدم ہیں اور بڑھتا فاصلہ ہی فاصلہ ہے

وُہ شاخِ دشمنی تھی، سرکشی پہچان اُس کی
ہُوئی ہے بار آور یا شجرِ عرفاں ہُوا ہے

عجب احساس ہے تم سے بچھڑنے کا ہواؤ
پلٹ کر جیسے ہم کو راستہ بھی دیکھتا ہے

تراشا ہے کوئی پیکر جہاں بھی ہم نے اپنا
لہُو کو اپنے ہی صد زاویہ تیشہ کیا ہے

وہ غم جو تیرے میرے درمیاں وجہِ کشش تھا
وہی غم راستوں کی زندگانی بن گیا ہے

ہم مٹ گئے نشانِ قدم چیختا رہا
تیرے بجھے تو اور علم چیختا رہا

ہم بے حسی میں سنگ سے آگے نکل گئے
سنتا ہے کون مونسِ غم چیختا رہا

سائل ہی میں وہ شورشِ باطن نہیں رہی
سائل نواز دستِ کرم چیختا رہا

مجبوریوں کے جبر سے چہرہ نڈھال تھا
میں چپ ہوا تو میرا بھرم چیختا رہا

تیری سماعتیں نہ کھلیں سبز پیڑ پر
حرفوں کی ٹہنیوں پہ قلم چیختا رہا

اشکوں کے بعد آتی ہے برسات پھول کی
سمجھے نہ ہم ہی دیدۂ نم چیختا رہا

یہ رہ گذارِ سنگ ہے بہہ جائیگا لہو
شیشوں میں ٹھہرا نقشِ الم چیختا رہا

قبروں پہ اب تو کچھ بھی نہیں دھول کے سوا
برباد ہوتا شہرِ حشم چیختا رہا

اِنکار قطرہ قطرہ لہو میں اُتر گیا
اقرار لب پہ رکھ کے قسم چیختا رہا

شبوں سے مل کے یہ بدنام تو نہیں ہوتی
نمودِ صبح، سرِ شام تو نہیں ہوتی

یہ رہ گزر بھی تو ملنے کا اک بہانہ ہے
ہمیشہ دید، سرِ بام تو نہیں ہوتی

ہزار ڈوب گئے ہم ترے اندھیروں میں
اُمید غرقِ مئے جام تو نہیں ہوتی

ہم اپنی ذات سے اُلجھیں کہ راہ میں بکھریں
یوں ختم گردشِ ایام تو نہیں ہوتی

پروں کو کھول، ہوا کے رموز پڑھنے ہیں
ہوا پرستی تہہِ دام تو نہیں ہوتی

ستارے اوڑھ کے نکلی ہے رات گھر سے مگر
سُلگتی شام کا انعام تو نہیں ہوتی

جو پاؤں کاٹ کے رستہ ہمیں دکھاتی ہے
وہ اور کچھ ہو رہِ عام تو نہیں ہوتی

بنامِ یار جسے ہم نے کر لیا تسلیم
وہ بات خاتمِ الزام تو نہیں ہوتی

ہم اپنی ذات سے پہچانے جاتے ہیں ہر سُو
شریکِ قربتِ بے نام تو نہیں ہوتی

ویران کیوں نظر ہو آباد کوئی گھر دے
پھر موج کو سفر دے پھر بحر کو بھنور دے

ناکامی، ناتمامی، رسوائی کا سبب ہیں
یا پھر تمام کر دے، یا کامیاب کر دے

مجھ کو دہکتے خوں کے اسرار کھولنے ہیں
بر فاب منزلیں دے، ویران رہگذر دے

گھائل ہوا ہوا ہے، اُڑتا ہوا پرندہ
زخموں کی پرورش کو تابندہ بال و پر دے

پیچیدگی سفر کی سایہ بھی چھینتی ہے
مَیں دھوپ میں کھڑا ہوں ڈھولوں کا ہمسفر دے

اپنے پرانے پن کا کب تک لبوں پہ رونا
بستی اُجڑ نہ جائے تازہ کوئی ہُنر دے

روشن مکانیوں میں پلتے رہے اندھیرے
جو رات سے چُھڑا دے ایسی کوئی سحر دے

اپنی شکستگی کا نوحہ پڑھوں میں کب تک
گرتے ہوئے مکاں کو پھر نقشِ بام و در دے

ہے ذات ہی کے رستے اک ذات تک پہنچنا
رستہ بڑا کٹھن ہے، عرفانِ خشک و تر دے

گلوں کا فاصلہ بڑھوا رہے ہیں
سفر کا مدّعا سمجھا رہے ہیں

ہمیں دریا کی قربت نے جلایا
سرابوں کی ڈگر پر جا رہے ہیں

ہوا مائل ہوئی الطاف پر کیا
بدن کے پیڑ جب مرجھا رہے ہیں

اندھیرے اُن کو شاید راس آئے
چراغوں کی لَویں کتروا رہے ہیں

بھری مجلس کو جو کرتا ہے تنہا
اُسی منظر کی جانب آ رہے ہیں

خواب ہوں، خواب سا پُر لطف جہاں ہے میرا
مَیں تو بستر پہ ہُوں، گردش میں مکاں ہے میرا

اَپنے ہی دل کی زمینوں پہ سفر کرتا ہُوں
آسماں، اپنی اُڑانوں میں نہاں ہے میرا

رات کے حق میں ہُوئی مہر، مری نقش گری
چاند تاروں میں مگر ذکر کہاں ہے میرا

شام پلکوں پہ سجاتی ہے جگنُوں کو اپنے
زرد ہوتا ہُوا انجام عیاں ہے میرا

دل کی تاریکی میں رَوشن ہُوں مثالِ خورشید
مَیں کہاں اَور کہاں نام و نشاں ہے میرا

مکاں کی روشنی میں، ہم بھی آکر
نیا ہونے کا دھوکہ کھا رہے ہیں

فصیلِ شہر کو ڈھا کر غضب میں
مکاں اندر مکاں پچھتا رہے ہیں

نئے رستوں کی دُھن نے مار ڈالا
مگر جینے کا تمغہ پا رہے ہیں

بُجھے تارے تو دل ہم نے جلایا
سدا بیدار شعلہ پا رہے ہیں

شہرِ خاشاک کی صحبت نہیں، محتاجی نہیں
شعلہ باطن میں لئے سیل رواں ہے میرا

میں کسی اور کے اسلوب کا محتاج نہیں
میرے اسلوب میں اندازِ بیاں ہے میرا

گردشِ ذات نے بیگانہ رکھا عالم سے
میں وہ ذرّہ ہوں، زمیں ہے نہ زماں ہے میرا

بے اماں خون اُسے اب بھی صدا دیتا ہے
بجھ گئے شہر، مگر شہر تپاں ہے میرا

سینکڑوں عالم ذرا سی جان میں رکھتے ہیں ہم
کیسے کیسے رنگ و بُو گُل دان میں رکھتے ہیں ہم

خون ہو، پانی ہو، مٹی ہو، کہ اونچا آسماں
وسعتوں میں مرتبہ کب دھیان میں رکھتے ہیں ہم

اُجلے دامن پر ذرا سا داغ بھی، ہم کو گراں
دھیان اپنا، کتنا ہر میدان میں رکھتے ہیں ہم

پیرہن تک ایک کانٹے کا گزر ممکن نہیں
پھول کی شرکت مگر ہر آن میں رکھتے ہیں ہم

ذکر اپنی ذات کا کرتے تو ہیں شام و سحر
اُس کی صورت بھی مگر پہچان میں رکھتے ہیں ہم

خُوں اپنا صَرف کرتے ہیں یقیں کے باب میں
اور اندیشے ہزار امکان میں رکھتے ہیں ہم

صُورتِ لالہ کھلے ہیں اپنے خُوں کے دشت میں
آگ بھی لیکن اسی چٹّان میں رکھتے ہیں ہم

دیکھنا، پڑھنا، سمجھنا، ذکر کرنا صُبح و شام
اُس کا جلوہ آنکھ کے جُزدان میں رکھتے ہیں ہم

زندگی کے بڑھتے رَوشن ارتقاء کے ساتھ ساتھ
قبر کا احساس بھی عرفان میں رکھتے ہیں ہم

تھکن کا نام ہونٹوں پر نہیں ہے
کوئی رستہ مرا ہمسر نہیں ہے

فلک پہ بس کے مجھ کو کیا ملے گا
زمیں کا غم اگر یاور نہیں ہے

میں جس کی آرزو میں مر رہا ہوں
یہ گھر تو ہے مگر، وہ گھر نہیں ہے

ابھی تو گفتگو بس حرف کی ہے
ابھی پیشِ نظر دفتر نہیں ہے

یہی توہین ہے دیوانگی کی
تمہارے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے

لہو کی زردیوں میں رنگ بھر دے
یہاں اک ایسا نغمہ گر نہیں ہے

پرندے ڈر گئے باغی ہوا سے
کہو، کیا یہ شکست پر نہیں ہے

خموشی کب مسائل کا بنی حل
سمٹنا ذات میں بہتر نہیں ہے

وہ خنجر اس لئے اٹھتا ہے ہم پر
ہمارے ہاتھ میں خنجر نہیں ہے

آزاد نظمیں

اَمانتِ غم

تمہارے آنسو کفن ہیں مجھ کو
تمہارے ہونٹوں کا جگمگاتا، مہکتا غنچہ چمن ہے مجھکو
کثافتوں کے نکیلے خنجر
مرے لہُو کی لطافتوں میں
اگر اُترتے رہیں گے یُوں ہی
مُجھے بتاؤ کہ روتی شاخیں ہنسیں گی کیسے
زمین اپنی اُجڑتی مانگوں کی بے کسی میں
سُہاگنوں کی دمکتی مانگوں میں
دہکی افشاں چُنے گی کیسے

زمیں سے جسم و جاں کا رشتہ، اٹوٹ رشتہ
حیات اور موت کا تسلسل ہی زندگی ہے
غموں سے رشتہ بنائے رکھنا ہی روشنی ہے

تمہارے دشتِ ہوس میں تنہا
مَیں غم کے بَرستے کا وہ شجر ہوں
کہ جس کے سائے دراز تر ہیں
کہ جس کے پھولوں کی خوشبوؤں میں
تمام عالم نہا رہا ہے
کہ جس کی شاخوں پہ دھوپ اپنے گھروں کی بنیاد رکھ رہی
مرے پھلوں میں وہ ذائقہ ہے
جو بھوک چکھ لے
زباں سے اُس کی ہزاروں صدیوں کو زخم دیتا
یہ بھوک کا سلسلہ ہی مٹ جائے
مرے عزیزو، مری حفاظت، مری سفارش
تمہارا شیوہ، تمہارا ذمّہ
مجھے بچالو جو چاہتے ہو
بدلتے موسم کی معرفت ہو
تمہاری دنیا حسین تر ہو
تمہاری کونپل بھی کل شجر ہو

مَیں غم کے رستے کا وہ شجر ہُوں
کہ جس کے پھولوں کی خوشبوؤں میں
تمام عالم نہا رہا ہے
کہ جس کے سائے دراز تر ہیں
کہ جس کی شاخوں پہ دھوپ لیٹے
سُکوں کی بنیاد رکھ رہی ہے

ہوا

ہرے بھرے شجر کی وہ سنہری سبز گفتگو
سُنی جو زرد ہوتی غم نصیب شام نے
لہُو میں غرق ، رات کے اَلَم کو بھُول کر
ستارہ ساز خاک کی ہنگار شوں میں کھو گئی
زمین ، رنگ و نور کا وہ مسکن حسین ہے
کہ جس کی خوشبوؤں کا جاں نثار آسماں وقار ہے
زمیں سے کٹ گیا شجر تو پھر کہاں بہار ہے
زمیں ہی موسموں کی جاں ، زمیں ہی بزمِ مہ وشاں

زمین ہی کے دل میں وہ چراغ ہے کہ جس کی لَو سے
مہر و ماہ لازوال تابشوں سے ہمکنار ہیں
ہوا کے دوش پر سوار ہو کے تم اگر
زمیں کی گفتگو کرو گے
کون سنتے آئے گا
بھٹکتی خواہشوں سے اپنا رابطہ بڑھائے گا
بلا کتوں کی نذر ہو کے
اپنی جاں گنوائے گا
ہوا، ہوا ہے
سوکھ جائے گا شجر تو راہ سے ہٹائے گی
جڑوں پہ وار کر کے اُس کو ہر طرح مٹائے گی

سایہ

یہ انجمنِ کاہکشاں، مستیٔ دریا
ویران جزیروں کے قدم چومتی لہریں
جب ریت کے سینے کا سفر کر نہیں سکتیں
جب اُجڑی ہوئی خاک کا دم بھر نہیں سکتیں
دل اِن کی طرف مائلِ پرواز رہے کیوں
انجام نگر، ہمدمِ آغاز رہے کیوں
بستی کے جھلستے ہوئے ہاتھوں کی دُعائیں
اک شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّے کی طرح ہیں

جب چاہے ہوا ان کا ہر اک نقش مٹا دے
آندھی کا وہی جبر ہے مٹّی کے گھروں پر
محلوں کے تسلّط سے پریشان ہیں رستے
آنگن میں کھڑا نیم کوئی سوچ رہا ہے
گرتی ہوئی دیوار کو کس طرح بچائے ؟
ہمسائے کو سائے کی پریشانی ہے لاحق
نزدیکیاں اب دوریاں پھیلانے لگی ہیں
سورج سے کبھی آس تھی تابندہ رُتوں کی
سو وہ بھی ہلاکِ سحر و شام ہوئی ہیں
ہر چھت کے لبوں پر ہے وہی دھوپ کا شکوہ
دیوار سے ، سائے کی جُدائی کا ہے موسم
سایہ ہے کہ سائے کا گلا کاٹ رہا ہے

فن کار

قلم اُٹھاؤں ، برش اُٹھاؤں ، کہ تیشۂ غم
دبیز کاغذ ، یہ سخت پتّھر نہ جب تلک خوں پئیں گے میرا
نہ لفظ سُورج نژاد ہوں گے
نہ سنگِ بے حِس سے دُودھ چشمہ رَواں ہی ہوگا بنامِ شیریں
خُدا ، بَشر اور حسینِ فِطرت کے درمیاں مَیں
وہ آئینہ ہُوں کہ جِس کا سینہ امین ہے اُن تمام عکسوں کا
جِس کو ہم سب ، ازل ، ابد کی کتاب کہہ کر
مَزے سے سُرخ و سفید اپنا سیہ لکیروں کے واسطے سے

وَرق وَرق پڑھ رہے ہیں جم کر
مگر اِسی جاگتے سفر میں جو قیمتوں کا سوال آئے
اُسے بھی پتّھر کے اُس ترازو میں تولتے ہیں
تمام، ہم تم
نہیں ہے نسبت جسے گہُر سے
گہُر سے جو آشنا نہیں ہے
یہ میری آنکھیں، یہ میرا سپنہ، یہ میرا وہ دِل
کہ قطرہ قطرہ لہو کا جن کے
چمن کو بخشے بہارِ تازہ
اُبھرتی دھرتی میں رنگ بھر دے
جو سنگ سینوں میں لَو جگائے
جو پائلوں کی خموشیوں کو دِلوں کے موسم کی نغمگی دے
جو ٹھہری جھیلوں میں سوز بھر کر گئی رُتوں کا
پہاڑی جھرنوں کو مات دے دے روانیوں میں
نئی رُتوں کی نئی طلب میں ہوا کا دامن اِسی سے مہکے
اِسی کی قُربت نصیب ہو تو بگولہ صحراؤں اور بہکے
اِسی سے کرنوں نے نور پایا
اِسی سے بادل کی پالکی پر دھنک نے اپنا کیا بسیرا
یہ خون گرجے تو ابر سہمے

یہ خون برسے تو سنگ کانپے

یہ خون سازوں کی تہہ میں اُترے تو نغمے تاروں سے ایسے پھوٹیں

پرندے جیسے شجر کی باہوں میں اپنا نغمہ الاپتے ہوں

یہ خوں خدا کی تجلّیوں کو جو جذب کرتا ہے اپنے تن میں

پہاڑ اُڑتا دکھائی دیتا ہے اُس ہوا میں

ہے ایک تنکا بھی بار جس پر

لہُو ہے سب کے بدن میں لیکن

لہُو لہُو کا ہے فرق یارو

لہُو ہے فنکار کا لہُو یہ

اِسے بھی تم جو لہُو سا اپنے ہی جان لو گے

تمہاری اندھی بصارتوں میں

بصیرتوں کے دِئیوں کا جلنا محال ہو گا

سفر تو پُورا کرو گے اپنا

مگر مقدّر زوال ہو گا

قدم کی بے پناہی پھر کوئی شعلہ نیا مانگے

یقیں کی چمپئی شامیں
گماں کے ملگجے بادل
شبوں کی مئے فروشی صبح کے آزادہ رو منظر
کسی شعلے کے سوزِ باطنی کا دائرہ در دائرہ
وہ رقصِ پیہم ہے کہ جس کی گردشوں میں
زندگی کے چاند ڈھلتے ہیں
نئے سورج ابھرتے ہیں
ستارے جھلملاتے ہیں

زمیں انگیز کرتی ہے حرارت اِس طرح اُس کی
سمندر اپنی لہروں سے اُبھرتے ساحلوں پر
نُور کی تفسیر لکھتے ہیں
سمندر آشنا قطرے سے مل کر میں نے یہ جانا
یہی شعلہ ہے، جو ارض و سما کی وسعتوں کو
اپنے قدموں میں جھکاتا ہے
یہی ہے، جو قدم کی تنگیوں میں
سوز بھرتا ہے قدم کی بے پناہی کا
یہی ہے، جو شکستہ خاک کے سینے میں
اِک دن خیمہ زن ہو کر
پتہ ذرّات کو دیتا ہے اسرارِ الٰہی کا
قدم اُٹھتے ہیں تو دریا سمٹ جاتے ہیں قطروں میں
قدم اُٹھتے ہیں تو صحرا سمٹ جاتے ہیں ذرّوں میں
دلوں کے سوز سے ملتا ہے جب اخلاص رُوحوں کا
جبینِ عرش پر، ہم کو نشاں ملتا ہے قدموں کا
قدم کی بے پناہی سے زمیں حیران و ششدر ہے
زمیں ہی سے مگر وابستہ تاروں کا مقدّر ہے
یہ شعلہ جس نے قدموں کو ادائے بے پناہی دی
نظر کو حیرت افزائی، دلوں کو خواب ڈھوتی

دل شکن گمراہ وادی میں
حقیقت آشنائی دی
چراغِ خانۂ دل ہے
امیرِ مجلسِ گل ہے
نمِ عرفانِ منزل ہے
یہ شعلہ اپنی پلکوں پر اگر رکھ کر چلے آنسو
زمیں کی آگ ویرانوں میں رنگ و نور بھر جائے
اُجڑتے موسموں کی بانجھ تقدیریں سنور جائیں
یہ شعلہ زیست کی تجدید و نُصرت پر اگر اُترے
فسردہ خاک سے
ہنستی ہوئی آبادیاں اُٹھیں
مٹا سب راستوں سے موت کے خیمے اُکھڑ جائیں
یہ شعلہ اپنے پژمردہ ارادوں میں اگر ذوقِ سفر بھر دے
زمین و آسماں کی حیرتیں انوار میں ڈھل کر
پروں کی بے کرانی میں سمٹ جائیں
یہ شعلہ بہتے دریا سے اگر مانگے کوئی رستہ
مٹانے نقشِ باطل، لہر اک اک لہر خود دیوار بن جائے
مخالف کو نگل جائے
یہ شعلہ خون پیتی کربلا کی ریت کی جانب اگر دیکھے

مقامِ صبر سے ہٹ کر
تو قاتل خود ہی اپنا سر سُپردِ تیغ کر کے سُرخروئی کی دُعا مانگے
یہ شعلہ منصبِ تحقیق پر فائز جو ہو جائے
تو ذرّے اور قطرے آپ ہی اپنے جگر کو چیر کر
باطن کی وہ تہ در تہ تصویریں دکھلا دیں
نظر جن تک نہیں جاتی
مگر یہ وصف اُن قدموں کو ملتا ہے
کسی بھی حال میں شعلے کو جو بُجھنے نہیں دیتے
وہ بد بخت جہاں ہم ہیں کہ جن کے سرد قدموں سے
کبھی اُس شعلۂ جاں بخش کی قیمت نہیں جاتی
نہ اپنی ذات میں کچھ دیر اُس کو جذب کرنے کی
کبھی کوشش ہی دکھلائی
کہاں ہے ذکر اپنا گردشِ مہر منوّر میں
سمٹ کر رہ گئی ہے اپنی دُنیا ایک چادر میں
قدم کی برق رفتاری سے کٹ کر مر گئے ہیں ہم
سفر کی دھول بن کر جی لئے تو کیا جئے ہیں ہم
وہی ہم ہیں
کبھی جو منزلوں کے دل میں رہتے تھے
وہی ہم ہیں

کبھی جو راستوں کے دِل میں رہتے تھے
ہمیں آسائشوں کو تج کے اُن رستوں پہ چلنا ہے
کہ جن کی آگ خود مُردہ ضمیروں کو جلاتی ہے
نئے اَنداز سے باآبرو جینا سکھاتی ہے

یہ شعلہ ہے
مگر محراب و منبر کی خطابت تک

یہ شعلہ ہے
مگر تاریکی میں ڈوبی قیادت تک

یہ شعلہ ہے
مگر بازار کی اندھی تجارت تک

یہ شعلہ ہے
مگر محدود ہے تکمیلِ غایت تک
سفر پر اب بھی یہ شعلہ اگر آمادہ ہو جائے
قدم کی بے پناہی کا ہمیں اندازہ ہو جائے

ندی مرچکی تھی

وہی چار سمتیں
وہی چاند، سورج
وہی عرش کے جگمگاتے ستارے
وہی وصل کی آس میں کٹتی فصلیں
وہی ہجر کے زخم دیتے ہوئے کھیت
وہی پختہ رستوں کے بنجر مناظر
وہی کچی مٹی کی ناقدریاں، غم
ہوس آدمیت کے خیمے جلا کر

خُدا جانے بستی سے کیا چاہتی ہے
چراغوں کے سہمے ہُوئے سرد سینے
لوؤں کی حفاظت کا ذمّہ کسے دیں؟
ہواؤں کے عفریت چاروں طرف ہیں
بھرے راستوں پر بھی آدمی جو
سبھی کی نگاہوں کا مرکز بنا تھا
اکیلا کھڑا ہے کچھ اِس حال میں اب
کہ ہر راہرو اُس کی نظروں سے بچ کر گذر جانا چاہے
کسی اور جانب
نفاق اور نفرت کا گہرا اندھیرا
زمینوں پہ قبضہ جما ہی چکا ہے
دلوں کو بھی پھر بانٹنا چاہتا ہے
نیا موڑ ہے یہ نئی زندگی کا
مکاں روشنی میں نہاتے ہیں لیکن
کسی کے بدن میں اُجالا نہیں ہے
مسافر کی بے چینیاں بڑھتے بڑھتے
عجب کیا ہے اُن سرحدوں سے بھی گزریں
جہاں آدمی آدمی ہے بظاہر
مگر آدمی کا گلا کاٹتا ہے

یہ جنگل، یہ صحرا ہی کیا کم تھے ہم کو، جو اب شہر بھی
بھیڑیوں کی شریعت کو اپنا کے
تکمیل کرنے لگے اُس خلا کی
کہ جس کا اَدھورا ہی رہنا بجا تھا
خُدا کے پُجاری، بُتوں کے نگہباں
اگر قتلِ انساں پہ خوش ہو رہے ہیں
یہ ہنستی زمینوں میں خوں بو رہے ہیں
جو آگے کسی کو بھی سایہ نہ دے گا
شجر در شجر سوگ زہری ہوا کا
رگِ سنگ حیران اپنی نمی سے
پگھلتی ہوئی ریت کیا گھر بناتی
بدن کی گھنی تشنگی کے کنارے
وہ زندہ تھی لیکن ندی مر چکی تھی

مشعلِ درد کہیں بجھتی ہے؟

ہوا کا پیرہن میلا بہت ہے
گھنی بارشِ کسی کنجِ قفس میں
سمیٹے اپنے پر، اپنی تمنّا غمِ پرواز میں ڈوبی ہوئی ہے
رواں سورج کی بے اندازہ کرنیں
زمیں کی ظلمتوں میں کھو گئی ہیں
مقدس چاند تاروں کی فضائیں
لہو کے داغ دامن میں سجائے
ستم کے پنجۂ خونیں کا نوحہ لرزتے کانپتے ہونٹوں سے اپنے

سسکتی خامشی میں پڑھ رہی ہیں
مخالف ہو گیا ہے دستِ رحمت ، بنائے کچھ نہیں بنتا کسی سے
بشر کا زعمِ باطل ، نازِ بیجا
پھر اپنے ہی گھروندوں میں پلٹ کر
ترقی کی منور رہگذاروں کا سلگتا جائزہ لینے میں گم ہے
کوئی پرساں نہیں حالاتِ غم کا
کسے ماتم کسی کی چشمِ نم کا
غرض دیوانگی کی حد سے بڑھ کر نقوشِ غم مٹانے پر تلی ہے
اُسے سمجھائے کیا سوزِ محبت
بشر کی عظمتوں کے راز کیا ہیں
بشر کے درد کے پھیلاؤ کیا ہیں
چمکتے ، دلکشا ، گلرنگ چہرے بنیں گے نور دشمن جو سفر میں
اجالا آج تک پہنچا نہ جن تک
اندھیروں میں گھرے اُن راستوں کا
رہِ ظلمت میں آخر کیا بنے گا ؟
سلگتی رہگذاروں کی ہوائیں
نئے پودوں سے اُن کا نور چھینیں
نئے منظر سے اُس کا روپ چھینیں
تو اِس پامال ہوتی رہگذر میں

وہ سوزِ درد جو حسنِ زمیں ہے
وہ جس کا معترف عرشِ بریں ہے
تصرّف جس کا دیکھا ہے بشر نے
زمامِ وقت جب ہاتھوں میں لے گا
غرض کو پوجتی ظالم ہواؤ
تمہاری آرزوئیں، رہگذاریں
کہاں ڈالیں گی اپنا خام ڈیرا ؟
کہاں دیکھو گی تم اپنا سویرا ؟

چُپ ہیں کیوں سارے روشن ضمیر؟

بجھ گئی روشنی کی لکیر
چیخ اُٹھے ظلمتوں کے اسیر
زندگی بن گئی پھر فقیر
عدل بیزاریاں، خود غرض بستیاں، وحشی خوں ریزیاں
زندگی بانٹتی رہگذاروں کی قاتل بنیں
نور کا قتل کر کے بھی عادل بنیں
دوڑتی پٹریاں، چمنیوں کا دھواں،
خون پیتی مشینیں، رہِ جسم و جاں

نُور کی جستجو، بارشِ رنگ و بُو،
آگ کے سلسلے، جاں کُشا مرحلے
سب کے سب جیسے نذرِ ہَوا ہو گئے
آپ، ہم جیسے اپنے کِئے کی سزا ہو گئے
بے جزا راستوں کی صدا ہو گئے
مکر کے بازیگر، مکر کی دُھند پھیلا کے چاروں طرف
اپنے نُورانی مسکن میں خوشبُو کے سائے تلے
ننھی معصوم کرنوں کا خوں اپنی کالی ہوس پر چڑھانے میں گُم
اپنے احساں جتانے میں گُم
بکھری، بےگھری، مفلسی عام ہے
بُجھ گئی روشنی، تیرگی عام ہے
علم کے نام پر لُٹ گئے تن میں آباد خوابوں کے گھر
صُبح خنداں تھی جن کی طلب
رات نے اُن کو بھی دے دیئے
دائمی جلتی راتوں کے گھر
جہل کی آڑ میں خود غرض تیرگی اپنے پرچم اُڑاتی رہی
اور اک بےنوا
تن پہ فاقہ لپیٹے ہُوئے اپنے چہرے کو پڑھتا رہا
وہ سیاسی نظر، مذہبی رہ گزر، شورشِ خود نگر

نکہتِ سیم بر، گرمیٔ خیر و شر، ہمدمیٔ بشر
مُنہ چھپائے ہوئے کس طرف چل دیئے
شعلہ کیوں سرد ہے؟
سبز کیوں زرد ہے؟
راہ کیوں گرد ہے؟
گرد کیوں فرد ہے؟
زخم اور درد میں فاصلہ بڑھ گیا
ظلم آسانی سے سب کے سر چڑھ گیا
خونِ ناپاک کی سرپرستی میں تکمیل پاتا ہوا
اندھا، بہرہ یہ تیرہ نظام
آج اپنے ارادوں کی تکمیل میں
سارے ناپاک جوہر سیہ رات کے
کام میں لے لے، لیکن بھروسہ کرے
کوئی شعلہ جہاں اپنی ضد پہ اڑا
شیشہ شیشہ بسیں گے سویروں کے گھر
اپنی پرچھائیوں کو سمیٹے ہوئے
رات خود اپنے پیکر میں دھنس جائے گی
صبح سے چھیڑ کرتی ہوئی پیار کی
نُور کے راستوں میں بچھ جائے گی

جلتے موسم، ہواؤں سے مربوط اپنی یہ بیتی نہیں
ہم نے دیکھا ہے یہ بارہا، کچھ زباں سے تو کہتی نہیں
یہ بھی سچ ہے مگر
دیر تک ظلم سہتی نہیں
صبر کا امتحاں
ضبط کا سائباں
محنتِ رائیگاں
سر اُٹھاتے ہیں جب، نیزے جھک جاتے ہیں
ظلم کے پاؤں کٹ جاتے ہیں
سایہ سایہ سیاہی کا غم
دھوپ آنگن میں اشکوں کا نم
چار جانب اُکھڑتے قدم
سب کو گھیرے ہوئے ہیں الم
پھر اُٹھے کوئی روشن ضمیر
چیخ اُٹھے ظلمتوں کے اسیر
زندگی بن رہی ہے فقیر

موسمِ جبر ہے

پیاس نیزوں کی بجھتی نہیں،
دھوپ رستوں سے ہٹتی نہیں،
چھاؤں پیڑوں کی بڑھتی نہیں
خاک سونا اُگلتی نہیں !
سیپ موتی میں ڈھلتی نہیں،
رات، کروٹ بدلتی نہیں
صبح پھولوں میں بستی نہیں
شام، خوں میں نہاتی نہیں

نور کے قافلے رُک گئے،
خوشبوؤں کے دیئے بجھ گئے
رنگ، پتّوں میں رشتہ نہیں اب کوئی پیڑ ہنستا نہیں
خیمہ خیمہ ہے وحشی ہوا، آگ لیکر چلی ہے صبا
بارشوں کا ٹھکانہ نہیں
خواہشوں کا ترانہ نہیں
اب وہ رنگیں فسانہ نہیں
رقص کرتا زمانہ نہیں
بستیوں میں اُجالا تو ہے دل کا اندھیارا مٹتا نہیں
اونچے اونچے مکاں تو بنے آدمی اونچا ہوتا نہیں
پستیوں میں گزر کیسا ہو، پورا اپنا سفر کیسا ہو!
راستے بن گئے ہیں سوال،
اہلِ دل، فکر سے ہیں نڈھال
بوڑھے پیڑوں سے ہیں مشورے
پھول مرجھاتے ہیں دن چڑھے
آس پر یاس غالب ہوئی۔ صبح راتوں کی طالب ہوئی
اژدہوں کی طرح اک اندھیرا گھروں کو نگلتا ہوا
آنگنوں سے گزرتا ہے جب
روح کانپ اٹھتی ہے، جسم چیخ اٹھتا ہے

بستیوں میں کہیں وہ سویرا نہیں
جن سے جس کی ساپنوں کی دہشت مٹے
اور ساپنوں کا یہ لشکرِ بے اماں
اپنا ہی زہر پی کر ٹھکانے لگے
آنکھ شیشوں سے دریا رواں، شعلہ شعلہ بچھا ہے دھواں
زندگی ایک خوابِ گراں، پا، کی آہٹ نہ کوئی نشاں
راستہ تنہا کیسے چلے
کوئی سایہ نہ جب تک اُٹھے
زندگی دیکھتا ہے ہمیں، قاتلِ زندگی کون ہے؟
دشمنِ روشنی کون ہے؟
کون وحشی درندوں سا پھر، پیکرِ آدمی میں چھپا؟
سادہ انسان کا خون پینے پہ آمادہ ہے
اُس کی بربادی کا آپ دلدادہ ہے
وہ نشاں اب تلک جو بھی مرحوم لاشوں کے سینوں پہ ہم کو ملے
دستِ زر کے سوا کچھ نہ تھے
خون پینے غرض کے سوا کچھ نہ تھے
اقتدارِ نفس کے سوا کچھ نہ تھے
بوالہوس تیرگی کے سوا کچھ نہ تھے
کالی تہذیب کے کالے کرتوت اب روشن آنکھوں سے پنہاں نہیں

ہاں مگر ظلم کا سر کچلتے ہوئے حوصلے اب طلبگارِ زنداں نہیں
خون کی لالیاں مر گئیں
چیختی ڈالیاں مر گئیں

راستہ راستہ ہے ہراس
یاس در یاس پھیلی ہے یاس
منزلوں پر جوانی نہیں
ضو فشاں اک کہانی نہیں
آس کا اک دیا کوئی روشن تو ہو
جگمگاتا ہوا ایک گلشن تو ہو
ورنہ آئینوں پر اوس پڑ جائے گی
کھلتے چہروں کا شعلہ بھی مرجھائے گا
زندگانی کا نقشہ بگڑ جائے گا

اور ظالم
سیاہی کے پرچم تلے
اپنی کالی شریعت پہ اترائے گا

ہنستا موسم، جلتی فصل

ہرا سارا جنگل
ہری ہیں زمینیں
شفق رنگ برقی ہرے راستوں میں
جدھر دیکھتا ہوں ہرا ہی ہرا ہے
کہیں زردیوں کا پتہ تک نہیں مسکراتی فضائیں
ہوا اپنے نغمے فضاؤں میں بھر کر
لب سبز کی ترجماں بن گئی ہے
گلابی اداؤں کی جاں بن گئی ہے

کہیں رقصِ طاؤس میں غرق موسم
کہیں بادلوں کے مدھر گیت سرگم
کہیں موجِ ارماں کے نازک بسیرے
کہیں شامِ رنگیں پہ قرباں سویرے
یہ راتیں، یہ صبحیں، یہ دوپہر جو
نگاہوں پہ اپنا تسلّط جمائے
نشاں بن گئے آج شادابیوں کا
انہیں کاش! وہ پیڑ بھی یاد آئے
جو اک روز ایسی ہی رُت میں جلا تھا
بہت شور تھا جس کی جلوہ گری کا
وہ ویرانیاں اُس کے ننگے بدن کی
وہ تشنہ لبی اُسکی سوکھی جڑوں کی
وہ عریانیاں اُس کی جلتی رُتوں کی
مری سبز آنکھوں میں ہیں قید ابتک
رُلاتی ہیں اکثر جو تنہائیوں میں
یہ احساس کی وہ لکیریں ہیں جن میں
دمکتے ہوئے چاند سورج ستارے
نظر آتے ہیں ہم کو بجھتے ہوئے سے
یہیں تو بھڑکتا ہے تن میں وہ شعلہ

جو وہم و گمان و یقیں کی سبھی چلمنوں کو جلا کر
ہمیں راکھ کا ڈھیر کرتا ہے پل میں
بدل جاتے ہیں ہنستے موسم بھی غم میں
مجھے زندگی کا سبق دینے والے مہکتے سویرو!
کسی دل جلی شام سے مل کے اک دن
مرے غم کدے کی طرف لوٹ آؤ
دکھاؤں گا وہ رات بھی اپنے تن کی
کہ جس نے سحر اپنی دیکھی نہیں ہے
تہی دستیاں جس کی ویران کن ہیں
جسے سبز جنگل سے نسبت نہیں ہے
کسی پھول نے جس کو دیکھا نہیں ہے
جسے اشکِ شبنم نے پرکھا نہیں ہے
یہ رشتوں کے موسم بہت دور تھے
اُس کے دل کی لگی سے
اُجڑنے کی رُت جب قریب آ رہی تھی
یہ شیشہ گری، سنگ کی بارشوں میں
دکھاؤ کسی ایسے پودے کو جس نے
ہرے موسموں کی تباہی نہ دیکھی ہو
محل سے بھری جگمگاتی ڈگر میں

کئی سال پہلے
مرے لب کی مسکان
جو پھول سی تھی
مرے دل کے ارماں جو شاداب سے تھے
مرے راستے جو
منور تھے میرے ہی اپنے لہو سے
جہاں دل کی فصلوں میں
ہیرے جواہر کی ارزانیاں تھیں
انہیں اس طرح لوٹا ہنستی رتوں نے
کہ ہنسنے کا اب
مجھ میں یارا نہیں ہے
مرا اپنے تن میں گزارا نہیں ہے
میں غمگین راہوں کا اجڑا مسافر
اجاڑا ہے جس کو ہرے جنگلوں نے
گلابی سفر نے جسے زردیاں دیں
تمہارے قدم سے قدم کو ملائے
اگر چل پڑا ابھی
مرا روتا ماضی تمہارے لبوں کی ہنسی چھین لے گا
مٹا دے گا چہرے کی ان سرخیوں کو

زمانہ جنہیں اپنے آتے سویروں سے منسوب کرنے لگا ہے
مجھے اب یہیں اپنی ویرانیوں میں اکیلا پڑا رہنے دو
تاکہ اتنا تو ہو
وقت سے پہلے شاداب پتّہ کوئی
آنچ پا کر مرے جسم کی
اپنی شادابیوں سے پریشاں نہ ہو
اپنے خوابوں سے ویراں نہ ہو

آگ سے بچ کے چلو

زندگی تیرا تجسس بھی گراں ہے کتنا
ہر قدم پر نیا احساس نئے اُلجھاوے
ہر قدم پر نئے حالات نئے اندیشے
راستے خود ہی اُٹھاتے ہیں وہ پُرسوز سوال
جنبشِ لب سے لپٹ جاتے ہیں ہر سمت ملال
آنکھ نے سنگ کو شبنم میں بدلتے دیکھا
دل نے پھولوں کو کبھی آگ اُگلتے دیکھا
روشنی، گاہ اندھیروں سے ملا دیتی ہے

تیرگی، گاہ اُجالوں کا پتہ دیتی ہے
ہر تغیّر ترا، تجدید بدن کی اپنے
تیرا مقصود ہے تہذیب چمن کی اپنے
تیرے دریا، ترے کہسار، رسیلے جھرنے
آندھیاں، زخمی شجر، پھول اگاتے رستے
غور کرتا ہوں تو محسوس یہی ہوتا ہے
راستہ راستہ پھیلی ہوئی ویرانی میں
تن کی شاداب تمنّائیں بھی، امتحانات منظر ہوں جیسے
آئینہ سازوں نے چہرے کو اُجالا تیرے
دستِ صنّاع نے پتّھر کو تراشا تیرے
تُو جو دریا سی کسی کوہ سے ہوتی ہے رواں
گُل کی پوشاک پہنتا ہے زمینوں کا دھُواں
تُو جو طوفاں کی قیادت پہ اُتر آتی ہے
لہلہاتی ہوئی ہر فصل اُجڑ جاتی ہے
وقتِ رخصت جو تری آنکھ سے ٹپکے آنسو
سیپ کی اُجڑی ہوئی گود میں چمکے جگنو
دریا دریا ترے نغموں کا وہ آہنگِ جواں
جس کی لہروں میں نئے سانحہ جنم لیتے ہیں
اور جو خواب میں ڈوبے ہوئے ساحل کو بھی

لہر کی شکل میں اُٹھتی ہوئی بیداری کی
خوشنما، دلنشیں تعبیر عطا کرتے ہیں
شاہ، محتاج، گدا، رستم و سہراب جہاں
عرش سے لڑتے ہوئے عقل کے تابندہ نشاں
فرش کی گود میں پلتے ہوئے پُر درد بیاں
صُبح سے شام تلک، شام سے پھر صُبح تلک
ہاتھ میں تھامے طلب کے کاسے
سب کو دیکھا ہے نظر تا اپنی
تیرے تفریق بڑھاتے ہوئے دروازے پر
سر نگوں، درد سے فریاد کُناں
کوئی تو ملتا جیسے رنگ کہیں
کوئی تو ملتا جیسے چنگ کہیں
کوئی تو ملتا جیسے سنگ کہیں
آج پھر عہدِ گزشتہ کی طرح
جھیل سی آنکھوں میں ٹانکے وہ بلوریں سپنے
صُبح کی دھوپ کے ہمراہ سفر پر اپنے
جب چلا ہوگا تو سایہ سایہ
موم سا آگ چھپائے ہوئے اپنے دل میں
اپنی ہی گرمیٔ احساس سے پگھلا ہوگا

شام کے پیڑ پہ سہمے ہوئے طائر کی طرح
اپنی منقار پروں میں ڈالے
رات کے خوف سے بکھرا ہوگا
پھر کسی شاخ میں سمٹا ہوگا

زندگی تیرے تجسس میں ازل سے اب تک
کچھ تجھے ہوش بھی ہے دوڑتے سناٹوں میں
کتنے پروانے ہوئے نور کی سولی کا سنگھار
کتنے پیڑوں کو جلاتے رہے دھوپوں کے شرار
کتنے خوش رنگ پرندوں پہ ہوئے تنگ اشجار

تشنۂ ذات کہوں یا اسے پندارِ ہوس
تو نے آزاد بہاروں کو بھی پہنائے قفس
پھول کو خاک کیا، خاک کے شہپاروں میں
گل کھلائے کبھی دہکے ہوئے انگاروں میں

کون الجھے تری بدمست نگہداری سے
تنگ آیا ہے سفر راہ کی پرکاری سے

زندگی، راہ گزاروں کے لئے آساں ہو
ہم سی ویران منڈیروں کیلئے آساں ہو
کب تلک تیرے یہ انداز یہ بگڑے تیور
کب تلک موج کے رستے میں یہ خونخوار بھنور

کب تلک شاخِ تمنّا پہ نہ پھل آئیں گے
کب تلک اُلجھے سوالوں کے نہ حل آئیں گے
تیری فطرت بھی وہی ہے مری فطرت بھی وہی
اک نہ اک موڑ پہ آخر تو کہیں ملنا ہے
کیا یہ بہتر نہیں اُس آگ سے ہم دُور رہیں
جس کو پھولوں کے مقابل میں کہیں کھِلنا ہے
زندگی آگ کی صورت میں اگر آئے گی
پھر یہ موسم، نہ یہ رنگین بہاریں ہوں گی
یہ مہک اور نہ یہ پُر کیف شعاعیں ہوں گی
آگ بھر جائے گی ساحل کے ہرے سپنے میں
راکھ ہی صرف نہ مٹّی کا مقدّر ہو گی
جگمگاتی ہوئی پلکوں کی ہری فصلیں بھی
اِس اُجڑتے ہوئے موسم میں جھُلس جائیں گی

اِلتفات

سُرخیاں بھر کے زرد چہروں میں
رنج و غم سے
چھُڑا تو دیتا ہے
ریشمیں اِلتفات کا موسم
ہاں مگر غمُوں میں جلتی شمعوں سے
روشنی اُن کی چھین لیتا ہے

سوچ

وقت کے بے کراں اِس سمندر سے بس
ایک لمحہ مِلا
آگ تپتی ہوئی ریت کو
ایک لمحے کی اوقات کیا
وقت تو ہی بتا کیسے معلوم ہو
لمحہ ڈھوتی ہوئی سرد سی لاش کو
سوچ کی ابتداء ، سوچ کی اِنتہا

امتحاں

دستکیں سب کی سُنتا ہے تیرا مکاں
دَر، دریچہ کسی پر بھی کُھلتا نہیں
راستہ تنگ بڑھتی ہوئی بھیڑ سے
کھول دروازہ
اپنوں کو آواز دے
پاس اپنے بٹھا
خود فریبی کو آخر پتہ تو چلے
کون محبوب ہے، کون مردود ہے

پتّھر

کیا گُل ہے، کیا گُل رعنائی
کیا دَھرتی
کیا اُس کی سَمائی
کیا سُورج
کیا اُس کی جُدائی
کیسی صُبحیں، کیسی شامیں
کیا اندھیارا
کیسی راتیں

کیا ٹھہراؤ بہاؤ کا نکتہ
منزل ہے نہ کوئی رستہ
خوشبو، رنگ، اُجالا سب کچھ
حق، باطل کا پھیرا سب کچھ
پتّھر وہ ہے
اپنی نظر سے
جس کو دِکھائی دے نہ یہاں کچھ

سراب میں بھی سفینے رواں ہیں دریا کے

نیلی جھیل، سنہرا آنچل، چاندی کے رُخسار
رُخساروں کا سونا بکھرا دمک اُٹھے گلزار
ساغر ساغر رنگ بسیرا جوش میں آئی بہار
سبز کلائی نے پہنے ہیں آگ کے اُجلے کنگن
دامن دامن اُجیارا ہے، مہک رہے ہیں آنگن
سُرخ چنار کے دہکے لب سے فطرت چھیڑے گیت
کہاں ہیں اپنے من کے میت
طاؤسی ملبوس پہن کر آئی بھیگی پھوار

جلے پھر من کے بجھے دوار

تن تن ہریالی نے اپنے بھیگے خواب سجائے

سورج کے جلتے ہاتھوں نے گل موتی برسائے

چاند کی ٹھنڈک ساحل ساحل ریت کی شکل میں بکھری

تاروں کی بھینی خوشبوئیں زرد گلی میں اتریں

رات شجر پر جگنوؤں کی باراتوں کا ڈیرا

پھر بستی کی جانب ہوگا جوگی من کا پھیرا

آوارہ بادل کی دھن پر جھوم اٹھے اشجار

دریا کے ہمراہ سفر میں لہرائے کہسار

گل کی جبیں پر نقش ہوئی ہیں شبنم کی تحریریں

جاگتی آنکھوں پر کھلتی ہیں آتے لمحوں کی تفسیریں

نیلی جھیل کے سبز ورق پر تازہ ہے ہر موسم

مہکے ہیں شاداب کنارے، شعلہ بنی ہے شبنم

شعلہ، شبنم، رقص ہوا کی دو زندہ تصویریں

خوں جاگے تو مل جاتی ہیں خوابوں کی تعبیریں

خوں کی غفلت، بھول سفر میں کانٹوں کی دیوار اٹھائے

خوں کی غفلت، منزل منزل ناکامی کی دھول بچھائے

خوں کی غفلت، عکس جلاتے شیشوں کو مٹی میں ملائے

خوں کی غفلت، کچھ نہ بنے تو ہر تازہ شعلے کو بجھائے

خوُن کی غفلت، جسم کے بہتے دریاؤں کے حق میں سراب
وَرنہ سَرابوں کی تہہ میں بھی دیکھے لہُو کی چنگاری نے
کھلتے ہوُئے دَریا کے گلاب
خوُن کی بیداری دریا ہے،
خوُن کی بیداری شعلہ ہے
خوُن کی بیداری نغمہ ہے
خوُن کی بیداری سبزہ ہے
خوُن کی بیداری میں ستارے، اَپنے جگر کے زخم عیاں کرتے ہیں زمیں پر
خوُن کی بیداری میں راتیں، چاکِ سحر سے مِل جاتی ہیں
خوُن کی بیداری میں کلیاں، کانٹوں میں بھی کھل جاتی ہیں
خوُن کی بیداری میں، عرش و فرش کے رَوشن افسانے ہیں
خوُن کی بیداری میں، زندہ رُنگ بدلتے پیمانے ہیں،
خوُن کی بیداری میں کہیں بھی ذکرِ سَراب نہیں مِلتا
دَریا دَر دَریا، دَریا ہیں، پیاسا عذاب نہیں مِلتا

اَندھیرا کیا تھا، اَندھیرا کیا ہے

سبھی کو اُس دِن پتہ چلے گا
یہ نُور کیا ہے؟ غرُور کیا ہے؟ سرُور کیا ہے؟
جو خواب میں کہہ رہا ہُوں خُود کو یہ خواب کیا ہے؟
حضُور کیا ہے؟ غیاب کیا ہے؟
سُنا سُنایا یقین میرا
گُماں کے لشکر قدم قدم کر رہے ہیں حیراں
خُدایا کوئی شعاعِ برحق بدن کی اِس تیرگی سے پھُوٹے
کہ میں سمجھ لوُں

بہار کے گلکدوں سے آ کر ملا ہے کیسے درِ بیاباں

گھنے شجر کا میں ایسا پتہ

نہ ہوش اپنا، نہ ڈالیوں کا

جسے نہ موسم کی کچھ خبر ہے، نہ علم ہے کچھ رہِ سفر کا

شجر نے چاہا تو پھوٹ نکلا

شجر نے چاہا اُجڑ گیا میں

نہ زرد میرا، نہ سُرخ میرا

عجیب ہوں میں عجیب ڈیرا

کبھی شجر سے جو اُس کے خوابوں کی رہگذر میں بچھڑ گیا میں

تو شاخِ جنت سے میری نسبت ہوئی ہے قائم

وہاں بھی اپنے شجر سے دُوری کا زخم دل پر اُٹھائے اپنے

میں خود بھی تنہا نہ رہ سکا جب

برائے تسکیں مری ہی رگ سے

شجر نے اپنی عنایتوں سے برائے تسکیں لطیف اک ایسا تحفہ بخشا

کہ جس کی دل کش لطافتوں میں سما گیا میں

ملائکہ کی صفوں سے ہٹ کر ادا سے کٹ کر

مگر وہ شعلہ کہ جس کا باطن سُلگ رہا تھا

مرے ہی اسرار و آگہی سے

مرے ہی عرفان و بندگی سے

اُٹھائے گندم کا بوجھ سر پر کچھ اِس طرح درمیان آیا
شجر کی مرضی کو بھول کر ہی
شجر کے سائے سے ایسے بچھڑا
کہ آج تک مہر و مہ کی گردش
زمینِ تیرہ کی کالی چادر اُڑھائے تن پر
بدلتے موسم کی ہمرہی میں
زمیں کے سینے میں بو رہی ہے نئے بدن میں اُگا رہی ہے
زمیں کی تنگی سے تنگ آ کر بڑھا جو میں روشنی کی جانب
قدم قدم بجھ گیا اندھیرا
عجیب ہے قسمتوں کا پھیرا
یہ ایک پتّہ جو اپنی نسلیں بڑھا کے آگے
زمیں کا پیوند ہو رہا ہے
زمیں کی سُولی پہ یُوں ہی لٹکا رہے گا کب تک ؟
یہ موسموں کے نصاب کب تک ؟
یہ نیکیوں کے حساب کب تک ؟
گناہ کا ارتکاب کب تک ؟
عذاب کب تک ؟ ثواب کب تک ؟
گھنا شجر بھی جو اپنے سائے کی روشنی میں
سُلگتی دھوپوں کو سر پہ سہتے، سُلگتے پتّوں سے

ٹھنڈکوں کا حساب لے گا
تو خواب میں کہہ رہا ہوں جس کو
درِ حقیقت سے جا ملے گا
کرم کی توقیر کیا رہے گی
بھرم کی توقیر کیا رہے گی
گھنا شجر، پھر گھنا شجر ہے وہی سمجھتا ہے بھید اپنے
وہی چھپاتا ہے بھید اپنے
کسی کی شرکت اُسے سفر میں گوارا کب ہے؟
سوائے اُس کے
کہ جس کے نوری بدن کو اُس نے
اُڑھائی رحمت کی چادر اپنی
سراب ہم کہہ رہے ہیں جس کو
اُسی شجر کی ہے دھوپ اک وہ
جسے بتایا ہے ہم نے دریا
اُسی کے خوابوں کی چھاؤں ہے وہ
وہی ہے موسم
جو رنگ و بُو کے نئے لباسوں میں ڈھل رہا ہے
وہی ہے شعلہ
جو روشنی کے نئے خزانے اُگل رہا ہے

وُہ اپنی مستی میں جھُوم اُٹھے تو
نئے زمانے ، نئے ترانے ، نئے پرندے
اُسی کے تن سے حرارتیں مستعار لیکر
جہانِ نو کی نئی فضا میں
سمٹتے ذرّوں کو آفتابی قبائیں دے دیں
مچلتی حسرت ، بدلتے رستے ، مہکتی منزل اُسی کے سائے
وہ خاک پر ملتفت اگر ہو
اُسی کے لب سے جِلائے مُردے
اُسی کے ہاتھوں سے بہتے دریا کے ٹکڑے کر دے
سُپردِ دریا سیاہ لشکر کے غول کر دے
جہالتوں کے عظیم لشکر کرن سے گھائل ہوئے ہیں اُسکی
بغاوتوں کے عظیم طوفاں
جڑوں کی پائل بنے ہیں اُس کی
گھنے شجر کا غضب نرالا ، کرم نرالا
رگ بدن میں سمٹتی آنکھیں احاطہ اُس کا کریں گی کیسے ؟
مگر وہ پتّے گھنے شجر سے جُڑا ہے جن کا ازل سے رشتہ
گھنی گھنی سی وہ ٹہنیاں کہ بسیرا کرتا ہے نُورِ جن میں
اگر پلٹ کر اُجڑتے پتّوں کی سمت دیکھیں
ہوا بنے

وہ زمین جس کی

رگوں سے جاری ہوں ایسے چشمے

زمیں سے وابستہ سارے پیڑوں کی خوش نمائی

سمیٹ لے اپنے منظروں میں ہوا میں اُڑتے بکھرتے پتّے

مگر شجر ہی اُجڑتے پتّوں سے بدگماں ہے

یہ واقعہ ہے یہ حادثہ ہے

یہاں سفارش نہ کام دے گی

یہ سانحہ ہے

بکھرتے پتّے تلاش کرلیں بُرائی اپنی

بدل لیں اپنی رسیہ ڈگر کو

اگر ہیں وہ روشنی کے طالب سفر میں اپنے

اسی میں عزت ہے ٹمٹیوں کے جلے دئیوں کی

اسی میں عظمت ہے اُڑتے پتّوں کی خوشبوؤں کی

زمین اپنا اُجالا اپنے ہی آنکھوں میں رکھے تو اچھّا

زمین گمراہیوں کو اپنی

سبق ہدایت کا دے تو اچھّا

زمین

خوابوں کی رہ گزر میں در حقیقت سے

اپنا رشتہ رکھے تو اچھّا

زمین
اپنی بلندیوں میں
ڈرے فلک سے بہت ہی اچھا، زمین
پھولے پھلے مگر پھر
اسی شجر سے جڑے تو اچھّا
زمین وہم و گماں کی زد پر
رہِ طلب سے بچے تو اچھّا
زمین
خوشبو کی سرپرستی میں
اور آگے بڑھے تو اچھّا
زمین
خود اپنے پیکروں میں شعاعیں بھر کر
اسی شجر میں بسیرا کرلے تو اور اچھّا
زمین
نورانی راستوں پر
چلائے سب کو تو اور اچھّا
زمیں پر
آسماں کا احساں بہت بڑا ہے
زمیں سے

سُورج کا رِشتۂ جاں بہت بڑا ہے
مگر یہ سُورج
کہ جس کی کرنوں میں
سارا عالم نہا رہا ہے
فیوض اُن کے اُٹھا رہا ہے
اُسی شجر کے
بس ایک پتّے کی روشنی ہے
شجر نے
کھُل کر بیاں کیا ہے
کوئی نہ مانے
سمجھ ہے اپنی
شجر کا اِس میں بگڑتا کیا ہے
شجر تو
اُس دِن کا مُنتظر ہے
تمام سائے
کھڑے رہیں گے جب اُس کے آگے
کھُلے گا دفتر نگار رشتوں کا
بلک اُٹھے گا ہر ایک سایہ
دہکتے سُورج کا

سُرخ نیزہ سَروں پہ ہوگا
سبھی کو
اُس دِن پتہ چلے گا
یہ نُور کیا ہے؟
غرُور کیا ہے؟
سرُور کیا ہے؟
حضُور کیا ہے؟
غیاب کیا ہے؟
جو خواب میں کہہ رہا ہُوں خود کو
یہ خواب کیا ہے
اندھیرا کیا تھا اندھیرا کیا ہے؟

زرد انقلاب

فضائے نیلگوں نے کروٹیں لیں
آسماں جاگا
تمدّن کے دریچوں میں
نئے انوار در آئے
کچھ اِس انداز سے
سورج نے لیں انگڑائیاں اب کے
اندھیروں کی فصیلوں سے
شعاعِ نور پھوٹی ہے

مہکتے موسموں نے
چاک کر کے اپنے سینوں کو
زمیں کی زردیوں کو
اپنے تن کی سُرخیاں دی ہیں
گل ولالہ
حجابِ شاخ کے پردوں کو ٹھکرا کر
جمالِ ذات کو پاتے
طوافِ ذات پر اُترے
جمالِ گُل کے شیدا
یعنی وہ شبنم کے آئینے
جہاں جلوؤں کی بارش عام ہے
پردے میں کیوں رہتے
ہے موسم بے حجابی کا
حجابِ ذات کو تج کر
ہمیں
اپنے لہو میں ڈوب کر
ہر بات کہنی ہے
لہو کی عظمتیں ہم سے
لہو کی شوکتیں ہم سے

لہُو کی ذِلّتوں میں

ہم نے ہی تہذیبؔ کی اُس کی

لہُو

وہم و تصوّر اور اَصنامِ خیالی کا

ہُوا جب بھی مُقیّد تو

لہُو نے

شمعِ عرفاں سے شعارِ معرفت لیکر

لہُو کی رہبری کی ہے

لہُو تو

دُرِ رشتۂ پیغمبراں ہے اِس کو غم کیسا؟

لہُو تو

شعلۂ تفسیرِ جاں ہے اِس میں نَم کیسا؟

لہُو

تلوار کو ذوقِ گُل افشانی سکھاتا ہے

لہُو

موجوں کو کشتی کی نگہبانی سکھاتا ہے

یہ طُوفاں ہے

مگر جلتے چراغوں کا محافظ ہے

یہی تو

حالِ، ماضی اور مستقبل کا واعظ ہے

لہُو

وہ دہکا انگارہ ہے

جو اخلاقِ باطن سے

کفِ انسانیت پر موتیوں کے طشت رکھتا ہے

لہُو کی تاجداری

شہرِ گُل سے دشتِ ویراں تک

لہُو کی آبیاری

پائے غم سے بزمِ امکاں تک

لہُو جب اپنی ہستی کے تعارُف پر اُترتا ہے

زمین و آسماں کو

اپنی پلکوں کی ترازُو پر

کسی تنکے کی صُورت

ایک پل میں تول دیتا ہے

لہُو

اپنے تقدّس کے فلک کا

وہ ستارہ ہے

کہ جس کی روشنی میں

حُور و غلماں اپنے پیکر میں

تمنّاؤں کا رنگ و نور بھرتے ہیں

لہو

لوح و قلم، عرشِ معلّیٰ، عارفِ ہستی

لہو

نطق پیمبر ہے

لہو

مشعل ہے رہبر کی

لہو

صد رنگ ہنستا جگمگاتا خوابِ ہستی کا

لہو کے راستے میں منزلوں کی رہنمائی ہے

اگر ہے کج ادا شعلہ کوئی تو گرد پائی ہے

لہو

ذوقِ شہادت کا ہے ایسا دلکشا پرچم

جہاں

ہر صاحبِ غم کی حیاتِ نو ہے تازہ غم

لہو مضراب ہے

سازِ زمیں سے چھیڑ کرتا ہے

نئے نغموں کی لَے سے

زندگی میں نور بھرتا ہے

چلو تسلیم

شہرِ شب کو خوں کی شوکت و عظمت

مگر اب کوئی بتلائے

کہ اِن ہنستے اُجالوں میں

چراغوں کے پسِ منظر

اَندھیرا حکمراں کیوں ہے؟

اَندھیرا کامراں کیوں ہے؟

مُنڈیروں کے چراغوں سے مکاں روشن نہیں ہوتے

اگر ظلمت ہے لفظوں میں بیاں روشن نہیں ہوتے

لہُو کی بیقراری کا سبب کیا ہے؟

کوئی ڈھونڈے

ہماری آہ و زاری کا سبب کیا ہے؟

کوئی ڈھونڈے

لہُو کی شہریاری سے مسائل حل نہیں ہوتے

وُہ اِنساں ہی نہیں ہیں جو زمیں میں خوں نہیں بوتے

لہُو

کب بانٹتا ہے آدمیت کو گھرانوں میں

بقائے وحدتِ آدم نہیں بچی اُڑانوں میں

کِسے معلوم

کب تک دشمنانِ عظمتِ آدم
لہو کی حرمتوں کی چاک دامانی روا رکھیں؟
کسے معلوم
کب تک آدمیت کی حریفائی
چراغوں کو بجھانے کے لئے محراب و منبر کی
مقدس بارگاہوں سے
شعارِ نور کی خاطر تڑپتی رہ گذاروں پر
ہوائے نور کی دشمن
گھنی تاریکیوں سے
کام لے اپنے مطالب کا
کرن
نام و نشاں تک بھول جائے اپنے طالب کا
اندھیرا پھر اندھیرا ہے
صراطِ نور کیا ہو گا
شبوں کی ہمنوائی سے اندھیرا، طور کیا ہو گا
لہو کی پستیوں نے کب کوئی سورج ابھارا ہے
ہم ایسے نور زادوں کو اندھیرا کب گوارا ہے

دُکھ بانٹتے ہونٹ

صُبح کے رُخ پہ غازہ نہیں

دوپہر
دھوپ کی ننگی چھت

شام
بیمار سی

رات
خوشبو سے محروم ہے
بُجھ گئے

چاند، سورج، ستاروں کے گھر
ذرّہ ذرّہ بجھا ہے لبِ ہوش پر
روشنی کا نیا مرثیہ
خوف
ویرانیاں
ظلمتیں
آدمی کا مقدّر بنیں
کیا محبت کی تبلیغ ہو
ہر طرف نفرتیں بچھ گئیں
اب وہ مذہب کہاں
جس نے انسان کے
مرتبے کو اجاگر کیا تھا کبھی
جس نے وحشی ہوس اور بہکی ہواؤں کے
پیروں میں زنجیر پہنا کے
ایسی گزرگاہِ پُر نور پر
روشنی سے مہکتے ہوئے خواب کو
روشنی سے بھری زندہ تعبیریں دی تھیں کبھی
اب تو مذہب،
تعصّب کا فرمان ہے

مقتلِ جان و ایماں ہی کیا
آدمی کُش
کُھلی سازشوں کا نگہبان ہے
ایسے مذہب سے کیا
رشتۂ جاں نبھے جس میں اِنسانی عظمت نہ ہو
ایسے مذہب سے کیا
آدمی خوش رہے جس کے چاروں طرف
وحشتیں
بھیڑیوں کی طرح
سادہ معصوم اِنسانوں کا
خوُن پی کر بھی ناشاد ہیں
لوگ
آباد ہو کر بھی برباد ہیں
حکمراں، جب سے ہے، زندگانی پہ شہرِ ہوس
راہ چلنا بھی دشوار ہے
سانس لینا بھی آزار ہے
آدمی
اپنے سائے سے بیزار ہے
گُل کا بدلہ یہاں خار ہے

بے کسی کا سہارا کوئی
زندگی کا اِشارہ کوئی
ظلمتوں میں سِتارہ کوئی

گُم ہُوئے مہر و ماہِ فلک
خواب لگتے ہیں جِنّ و مَلک
اب خدائی سے کچھ آس ہے
اپنی تقدیر میں دُور تک
جیسے سُوکھی ہُوئی گھاس ہے

خون کروٹ بدلتا نہیں
نیند غالب ہُوئی ہوش پر
سُرخ انگارہ دہکے کوئی
برف سی پڑ گئی جوش پر

اِس سے پہلے بھی اُٹھّیں یہاں آندھیاں
اِس سے پہلے بھی برسیں یہاں بجلیاں
اِس سے پہلے بھی دل میں چُبھیں برچھیاں
اِس سے پہلے بھی موسم نے لیں کروٹیں
اِس سے پہلے بھی اکثر جلیں کونپلیں
اِس سے پہلے بھی روندی گئیں حسرتیں

پیٹر:

ایسے مگر چُپ نہ تھے جس طرح آج ہیں

سایہ سایہ ہے عزّت کا غم
دھُوپ میں جل رہے ہیں عَلَم
شَل ہوئے عصمتوں کے قدم
کوئی شعلہ تو ہو
ہمقدم، کوئی رستہ تو ہو
بے گھری کا مداوا تو ہو
منزلوں کی طرف
آنکھ اُٹھتی تو ہے پاؤں بڑھتے نہیں
پستیوں کے مکیں
کسمساتے تو ہیں زینہ چڑھتے نہیں
پست ہمّت کو دے موج کی سرکشی
بال و پر میں پرو، پھر نئی آگ سی
پھر جگا سنگ میں روح تحریک کی
آنسوؤں کی حمایت گئی رائیگاں
بارشوں کی خطابت گئی رائیگاں
خوں رُلاتی صحافت گئی رائیگاں
آئینوں کی نجابت گئی رائیگاں
زندگی کا وَرق اب بھی سادہ سا ہے

اب بھی بے جان ہے
لفظ، اپنے ہی معنیٰ سے انجان ہے
مَیں خطابت نہیں
مَیں صحافت نہیں
مَیں حمایت نہیں
مَیں نجابت نہیں
رُوحِ عصرِ رواں
اپنے ہی ہونٹ اپنے ہی خوں سے لکھی
تازہ فریاد ہوں
چشمِ احساس وا ہے اگر
مجھ کو پڑھ غور سے
مَیں ہی تیری خموشی کا وہ
برملا سخت اعلان ہوں
زلزلہ، جس سے آتا ہے ایوان میں
آگ لگ جاتی ہے
ہنستے گلدان میں
جان پڑ جاتی ہے
جسمِ بے جان میں
جسم و جاں کے حصاروں میں جو

رُوح کے زخم گنتا رہا
زندگی کیلئے
اُس نے کب
کوئی رستہ گلوں کو دیا
راستہ آپ بڑھتا نہیں
جاں کی بازی لگاتے ہیں ہم
منزلیں آپ آتی نہیں
عُمر اپنی گنواتے ہیں ہم
پھُول، ایسے ہی کھلتے نہیں
خُون اپنا پلاتے ہیں ہم
پیڑ، ایسے ہی ہنستے نہیں
اشک، اپنے چھپاتے ہیں ہم
ہم، محافظ
زمینوں کی مُسکان کے
ہم، نئے راستے
اپنی پہچان کے
قدر داں ہیں
ازل ہی سے انسان کے
ہم ہی دُکھ بانٹتے ہونٹ انجان کے

زنجیر نئی، جھنکار نئی

اَے عہدِ گذشتہ کے لوگو
تادیب نہیں، تہذیب ہے یہ
بدلی ہوئی قدریں اپنا لو
جو وقت کی عارف بن نہ سکیں
وہ بجھتی لکیریں فکروں کی
اپنے ہی کفن میں دفنا دو
شاعر کا قلم، مطرب کی نوا، عاشق کی تڑپ
نغمے کا فسوں، پتھر کے صنم، حالات کے غم

تصویرِ کائنات، ہمدوشِ ہوا، پُرنُور قدم
پھولوں کی رِدا، تتلی کی دُعا
پازیب کی ہنستی کھلتی فضا
کوندوں کی لپک، غنچوں کی چٹک
ذرّوں کی اُفق سے پار نظر
بجلی کے طبق ہاتھوں میں لیئے اب چاہتی ہے
یہ عصرِ رواں
اِس آتشِ سنگ و آہن سے یُوں ڈھالے کوئی زنجیر نئی
کہ جس کی نئی جھنکاروں سے، اشکوں کے الم سہتی نگری
مُسکان سجائے ہونٹوں پر
جینے کا نیا پیغام بنے
عنوانِ سُرور و جام بنے
تسکینِ غم و آلام بنے

بیناز خسم

پھُول کی کِرنیں، چاند کی خوشبُو،
سُورج کا گہرا اَندھیارا
جب بھی لہو میں گھر کرتے ہیں
قطرہ قطرہ، رنگ کے لشکر، نُور کے ڈیرے
خوشبُو کے منظر ملتے ہیں
ذرّہ ذرّہ، آگ کے پیکر
شبنم کے آئینے بن کر
پلکوں کے موتی میں اپنی

اُجلی حرارت، تیکھے نموُ کے عکس اُگلتے
راحت زا شعلے بھرتے ہیں
فطرت کے روشن رستوں کی محتاجی ہے
سب کو لیکن
سچ پوچھو تو
مُجھ کو
اندھی راہ کے
بے پناہ زخموں نے مہکایا ہے

اِک وہی درِ نجات کا در ہے

وہ ذات اگر اَب بھی
پتّھر کی طرح چُپ ہے
منبر کی طرح چُپ ہے
مسجد کے مناروں کی جبروتی صداؤں کا
ملکوتی فضاؤں کا، معراجِ محبّت کا
بے لوث عبادت کا
وہ سوز کہاں جائے، وہ درد کہاں جائے
ہم جس کو نمازوں کے پُر نور وسیلے سے

سجدوں کا نشاں کہہ کر
اُس ذات سے مِلتے ہیں
تخلیقِ بشر جس کی عظمت کی نشانی ہے
بے مثل کہانی ہے
آدم کی پریشانی، آدم کی گراں جانی، آدم کی نگہبانی
اِس عہد کے منظر میں
قیمت ہی نہیں رکھتی
مٹّی نے تصرّف کا وہ جال بچھایا ہے
مٹّی کے ارادوں سے
مٹّی کے جزیروں میں
اُڑتی ہُوئی مٹّی پر
اک خوف سا طاری ہے
آتا ہُوا ہر لمحہ، احساس پہ آری ہے
ہر سانس پہ بھاری ہے
تہذیبِ بشر
اپنی اونچائی کو کھو دے گی
سوچا بھی نہ تھا ہم نے
بے رُوح ارادوں کی، بے رُوح سی بستی میں
جسموں کی چتاؤں پر

جسموں کا گزر، ہونا ممکن بھی اگر ہوتا
روحوں کے تجسّس کا یہ جذبۂ لولاکی
تسکین کہاں پاتا؟
گھٹتے ہوئے انساں کی گھٹتی ہوئی سانسوں میں
ہاتھوں کی درازی نے کاٹے ہیں قدم ایسے
اپنی ہی زمینوں پر اب رینگتے رہنا ہے
سہمے ہوئے جذبوں کو
جھلسے ہوئے سینوں کو
انصاف ہو مقتل جو انصاف کی قدروں کا
شعلہ ہو مقدّر جو ہنستے ہوئے پھولوں کا
وہ غنچے
جو شاخوں کے سینوں سے نہیں پھوٹے
وہ گہنے
جو شاخوں نے پہنے ہی نہیں اب تک
وہ رنگ وہ خوشبوئیں، جو زینتِ ہستی ہیں
وہ نور
جو پیڑوں کے ریشوں میں مچلتا ہے
مستانہ ہواؤں سے کب دادِ سفر لے گا
کب ایسی خبر دے گا

بڑھتے ہوئے رستوں میں

جو پھول بچھاتی ہے، تاریکی مٹاتی ہے

اِس عہد کے اِنساں نے

تدبیر کے ہاتھوں سے

تقدیر کے پرچم کو نیچا تو دِکھایا ہے

لیکن اِسی اِنساں کو

خُود اپنی تمنّا کی سُولی پہ چڑھایا ہے

مقتل سے

گلابوں کی تخلیق کے سودائی

بے رنگ قفس اپنے

پھُولوں سے سجا کر بھی

خوش رنگ پرندوں کو محصُور نہ کر پائے

اِس سوگ میں ڈوبے ہیں

اپنے ہی حصاروں میں

پتّوں کے تموّج سے چلتا ہے پتہ اُن کو

وہ آنکھیں جو ہر لمحہ

گلشن کی فضاؤں پر رکھتی ہیں نظر اپنی

مٹتی ہوئی مٹّی پر

مٹّی کے کھلونوں کے

میں خواب نہ دیکھوں گا

اے جذبۂ حقانی، اے فطرتِ انسانی، اے شورشِ وجدانی
اے شعلۂ رُوحانی
انسان کی فطرت کا کچھ اور تقاضہ ہے
کچھ اور ہی منشا ہے، کچھ اور ہی جلوہ ہے
یہ صبح کے دامن میں
چہکار پرندوں کی
مسجد کے مناروں سے
یلغار اذانوں کی
حجروں میں، منادر میں
بھرمار صداؤں کی
اعلان ہے اُس حق کا جو رات کے ماتھے پر
سُورج سا چمکتا ہے
اندھیارے کی ہستی کیا
اندھیارا ہے، اندھیارا بڑھ جائے اگر حد سے
اپنی ہی ندامت کے
مسکن میں سمٹتا ہے
اُس ذات کی خاموشی
انساں کی تباہی پر

آنکھوں کو رُلاتی ہے سینوں کو جلاتی ہے

انسانوں سے تو انساں کا ہر زخم نہیں بھرتا

بے زخم تو انساں بھی فریاد نہیں کرتا

اَب وہ ہی کنارا دے

ٹوٹی ہوئی کشتی کو

ڈوبی ہوئی بستی کو

سہمی ہوئی ہستی کو

لہروں کے لبوں پر بھی آیت ہی ملتی ہے

جلتے ہوئے لمحوں کی

بکھری ہوئی سانسوں کی

پُر درد سویروں کی

اُلٹی چھتیں، اُلٹے شجر

شجر کی قید سے آزاد اک ہینا پرندہ
اپنی پروازوں کے
انجانے سفر سے لوٹ کے اکدن
اک ایسے پیڑ پر اُترا
گھنی شاخوں میں جس کی
جاگتی سوتی ہوئی صدیوں کے سارے موسموں کے
پھول، پھل، پتّے
دمکتے جگنوؤں کی شال اوڑھے

رات کی گہری خموشی کو، برنگِ برگِ تازہ
اپنے لہجوں میں گھلی تازہ سحر کے
حسن زا جلوے دکھاتے تھے
وہیں چمگادڑوں کا ایک وہ لشکر بھی تھا جس کو
عصائے دستِ قدرت نے
درختوں پر سدا اُلٹا لٹکنے کی سزا دی تھی
پرندہ محوِ حیرت تھا کہ اُن آنکھوں سے
کیسے گفتگو ہو
چڑھتے سورج کی
جنہیں دن کے اُجالے میں نظر آتا نہیں کچھ بھی
جنہیں سیدھی چھتیں، سیدھے شجر
اُلٹی چھتیں، اُلٹے شجر معلوم ہوتے ہیں
پرندہ چاند کو تکتا کبھی اُن رہگزاروں کو
جنہیں ہم
کہکشاں کے نام سے منسوب کرتے ہیں
دکھاتا زخم سینے کے
کبھی لچکیلی شاخوں سے پیڑوں کی داستاں کہہ کر
فضا کے نرم شانوں پر وہیں سر رکھ کے سو جاتا
پیڑوں میں چونچ کو پھیرے

عجب وہ رات تھی، وہ رات کا اندھا سفر، پورا
نہ کوئی رازداں اُس کا، نہ کوئی ہمزباں اُس کا
فقط اک سوزِ باطن تھا
کہ جس کی ہمکلامی سے اُسے
دل کا سکوں ملتا
ہوا کے تال پر پتّوں میں جاگیں
رقص کی لہریں
اچانک صبح کا تارا جبینِ صبح پر چمکا
شجر کی شاخ پر بیٹھا پرندہ نیند سے
بیدار ہو کر پھر
اُسی کھوئی ہوئی منزل کا غم آنکھوں میں بھر کر
اپنی پروازوں میں پھر سے ہو گیا شامل
ہوا نے مرحبا کہہ کر لگایا اپنے سینے سے
شجر کی قید سے آزاد، اک بیتا پرندہ
اُن پرندوں سے کریگا گفتگو کیسے؟
چھتیں اُلٹی، شجر لٹے ہیں جن کی رہگذاروں کے

عام نہ ہو و پرانی

رُوٹھے موسم

تیکھے جھرنے، بادل کا بن باس

لبوں پر پیار ملن کی آس

بُوند بُوند اندھیارا پھیلا

جاگے چِت چکور

بدن کے رستے بڑے کٹھور

چاند نگر میں

تارہ تارہ اپنے خواب میں کھویا

سورج، کالی چادر اوڑھے
تن کی گپھا میں سویا
مَیں تجھ بن اِس ڈار کے پنچھی
جل بھیتر بھی اپنی جڑوں سے اُٹھتے دھوئیں کے
سوگ میں ڈوبا پتّہ
جسم کی شاخیں،
رُوح کے غنچے،
نرم ہوا کے جھونکے
کالی آندھی ایسے چڑھی سر
کھوکھلے ہو گئے پیڑ
خوابِ صبا مٹھ بھیڑ
پیا
کیا یُوں ہی جلے گی منڈیر
مور، پَروں میں
رنگوں، رنگوں، شنکھ، اذاں کا جھگڑا
آگ نگر میں کیسے ہوگا
صَوت و صدا کا پھیرا
نفرت کی بیمار گلی میں چاہ بسیرا کیوں ہو
اندھیارے کی کوکھ سے پیدا کوئی سویرا کیوں ہو

تن چندن پر ڈالی ڈالی
پھن پھیلاتی ساپنوں کی پھنکار
مکمل کیا ہو کوئی سنگھار
چاٹ رہے ہیں کرنوں کا خوں جنگ کے کالے بادل
سوکھ رہی ہے کونپل
پائل گونگی، جلتی چنری، انگنائی میں سوگ
عجب ہے اب کے تنوں کا روگ
جوگ، بھوگ کے راج سنگھاسن جل کر راکھ ہوئے
بستی بستی
پھیلی ہوئی ہے
کڑوے دھوئیں کی رت
من کا پنچھی
ڈھونڈ رہا ہے
ہریالی کا موسم
کہاں وہ
رنگ میں ڈوبا سرگم
خون کی ہولی کھیلنے والے
اجلا رستہ چھوڑ کے کب تک
تاریکی کے ساتھ رہیں گے

منزل کو ٹھکرا کے چلیں گے

کب تک آنکھ کے سہمے شیشے

اپنے خوں میں غسل کریں گے

زخمی احساسات سے کبتک

تن سائے آکر نہ ملیں گے

دن کی بھینٹ چڑھیگی کب تک

رات کی اُجلی حسرت

کب تک رُسوا ہوگی آخر بیچ ڈگر میں

ایک غریب کی میّت

پنگھٹ ویراں، گھونگھٹ حیراں

پاؤں میں چُپ زنجیر

بجھا سا کاجل کا ہر تیر

وحشی ہوا کو

سونپی گئی ہے پھولوں کی رکھوالی

آنکھ میں شبنم دیپ جلائے

روئے باغ کا مالی

آم کے پیڑوں کی خوشبو پر چھائے کالے ناگ

کوئل

بھول گئی سب راگ

بے بس بستی

آگ کے گھر سے جل کی بھکشا مانگ رہی ہے
رستہ رستہ راکھ بچھی ہے
روشن آنکھیں بجھ جائیں تو
جلوؤں کے دیپک نہ جلیں گے
اندھے رستے کتنا چلیں گے
منزل منزل
ایک نیا اندھیارا اُٹھے گا
بے چہرہ انسان کوئی پھر
کیا اندھی آیات پڑھے گا
چہروں کی تعظیم اُجڑ کر بستی کو ویران کریگی
ہنستی بستی آبادی کو لاشوں کی خاموشی دیکر
سوگ بھرا شمشان کرے گی
جلتی رتوں میں بھیگا تبسّم
غنچوں کے افسردہ لبوں پر قائم رکھنا
عینِ عبادت، عینِ شرافت
تن کے سبزہ زار اُجڑیں تو
ہرنوں کی یہ ڈار نہ ہوگی
پنچھی پنچھی دُکھ پھیلے گا

بادل سنگ بہار تہ ہو گی

بہتے جھرنے

کب تک راہ کے پیچ وخم سے

لڑتے رہیں گے

کب تک آگ میں

جلتے رہیں گے

تن کے موسم میں اب ایسا

ایک ہرا موسم بھی آئے

تن تن پھیلے نور کا بادل

آنگن آنگن ہریالی ہو

چولی چولی بگیا مہکے

آنچل آنچل بیتابی ہو

آنکھ کے بن میں مور سلونے

اپنا رنگ رچائیں

رقص میں دھرتی آئے

شبنم پہنے پھول کے گجرے

لٹ لٹ خوشبو بکھرے

بدن بدن انگارہ دہکے

بندیا بندیا چمکے

پیڑوں کی چاندی سے اُلجھے
مہندی کی پازیب
سوکھے ہونٹوں پر لہرائے
رنگ لٹاتا میگھ

سینہ سینہ دامنی دمکے کھل جائیں گُل بوٹے
کانٹوں کی بیری آنکھوں میں نقش بنائیں
طاؤسی پیکر میں اپنے خوابوں کے جل پھیرے
دھوپ کی بازی جیتنے والے سایوں کو اپنائیں
رستے مہکیں، سائے چہکیں، موڑ سہانے آئیں
ویرانی کے جال پرانے اب آنکھوں کو ڈسنے لگے ہیں
اب تو شجر آزاد ہوئے ہیں
پنچھی کی آزاد اُڑانیں اب نہ ہوا پر بوجھ بنیں گی
لیکن سوکھے پتّوں کی بھی
تعظیمیں آنکھوں میں رہیں گی

یہ موسم دل کا موسم ہے
اس کے روپ انوکھے، اس میں کہاں دُکھ میلے
شادابی گھر گھر لہرائے، پھیکا رنگ نہ بھائے
چہرہ چہرہ بنے سُہاگن. سہمے کنگن گائیں
پیا
بس میری یہی دعائیں

جرس جرس بجھی صدا

اِمامِ جہل کی
کالی شریعت کے نتیجے میں
لہو کی پاک دامانی بھی اکثر چاک ہوتی ہے
ہوا نفرت کے شعلے بیکرِ اُلفت میں بھرتی ہے
فضا نذرِ ہوس ہو کر
خود اپنا سر چھپائے
ایک چادر کو ترستی ہے
تمنا فوقِ کشتِ ویراں راہ میں آتی بہاروں کو

ہلاکت کا نیا عنواں سُجھاتی ہے
حسد کی آگ میں جلنے کو
جینے کی نئی صورت دِکھاتی ہے
ہر اِک موسم
غرض کی کونپلوں کو
اک تناور پیڑ کی صورت عطا کرتے
خوداپنے رنگ میں ڈوبی
بلند وپست اور اطراف پر چھائی ہوئی
آیات پڑھتا ہے
بدل جاتی ہیں تحریریں
بدل جاتی ہیں تفسیریں
ستم کی تیغ لکھتی ہیں
بنامِ عدل تقدیریں
چراغوں کے دھوئیں کی نذر ہو جاتی ہیں
تدبیریں
نئے گُل کھِلتے ہیں زلزلے
پُر امن بستی میں
لہو پامال ہوتا ہے تمیزِ ذات کی خاطر
بلندی اور پستی میں

خُداوندا! حوادث کی سیہ آندھی
کسی گھر سے گزرتی ہے
تو یوں محسوس ہوتا ہے
کہ مَیں بھی زرد پتّے سا
شجر سے ٹوٹنے کا کرب
اپنی رُوح میں بھر کر
عدم کی سمت بے سوچے نہیں
احساس میں
سب موسموں کا تحفۂ بے رنگ و بُو لیکر
خود اپنی ذات کے آئینہ خانے میں
بکھرتی، ٹوٹتی معصوم کرچوں کے دہانے پر
حُباب آسا
سمندر کے سفینے پر کھڑا ہوں پھبتیاں کستے!
سمندر کی خموشی رُوح میں ہلچل مچاتی ہے
مجھے خود اپنی غرقابی
فنا نا آشنا لہروں کے
وہ نغمے سُناتی ہے کہ جن میں زندگی
طاؤسِ خوش انجام کے رقصِ مسلسل پر
مہکتی چاندنی کی چادریں

تن پر اُڑھاتی ہیں
فضائے رنگ و بو میں آفتابی پائلیں
صد رنگ کرنوں کے
حیات افزا ترانے بُنتی رہتی ہیں
ہوائیں چیختی پھرتی ہیں
کوئی ہمنوا آئے
کوئی مشکل کُشا آئے
کوئی راحت رساں آئے

ہمارے پاؤں اب
آوارگی کے زخم سہنے کی
توانائی نہیں رکھتے
ہمارے گھر
شکستہ آئینوں کی طرح
پرچھائیں نہیں رکھتے
ہمارے عزم
شعلوں سے اُلجھنے کی
شکیبائی نہیں رکھتے
ہوائیں مرثیہ خواں ہیں
خُداوندا!

حوادث کی سیہ آندھی
ہمیں بے تاب کرتی ہے
ہمیں غرقاب کرتی ہے
ہماری رُوح میں اپنی تجلّی کی
کوئی ایسی ادا بھر دے
کہ جس کی ایک انگڑائی سے
اپنی نیند میں کھویا ہُوا عالم
رگِ بیداری کے حق میں
تڑپتا خون ہو جائے
سُرورِ جام ہو جائے
درِ اصنام ہو جائے
سحر آشام ہو جائے

آس معدوم ہے

دُور تک کوئی نہیں
کوئی نہیں
کوئی نہیں
یاس کی تنگ گذرگاہوں سے
لوٹ آئی ہے نظر
اپنے شیشوں پہ اداسی کے نئے زخم لئے
روشنی،
رنگ،

اچھوتی خوشبو،
رقص،
پازیب،
کنواری مہندی،
نغمہ،
سُر تال
رسیلی تانیں
ابر کے غول
دھنک کے گھونگھٹ
چاند کے ٹکڑے
روپہلی چاندی
گُل کے دامن سے اُلجھتی کرنیں
آہنی عزم
سلاسل کی نوازش
نہ وہ زنداں کے چراغ
ملگجی شام
شفق زارِ ہوس
زردیاں اوڑھے تعاقب میں ہرے موسم کے
اپنے چہرے کے خد و خال بھی کھو بیٹھے ہیں

شب کی شہزادی پھٹے کپڑوں میں
چیختی پھرتی ہے دیوانی سی
اُن دہکتی ہوئی تاریک گذرگاہوں پر
جن میں عصمت کے چراغوں کا لہو جلتا ہے

کھیت
کھلیان
مہکتی فصلیں
گھر
ہمکتے ہوئے دالان
چہکتے رشتے
شور
بازار
کھنکتے سکّے
قصر، ناقوس
اذان
مدرسے
ہنستے بچے
باغ
ویرانے

جَبَل

رنج مٹاتے دریا
اک سیہ آندھی چلی
ریت گھروندوں میں ہوئے سب تبدیل
زندگی بن گئی قبروں کا سکوت
اب کوئی رنگ نہ تابندہ نقوش
گھر کے آنگن سے بچھڑتے ہی پتہ چلتا ہے
راستہ پوچھتی بھٹکی ہوئی غم خواری میں
زندگی خواب ہوئی ہو جیسے
آس معدوم ہوئی ہو جیسے

نئی معرفت کی خوشبو

کبھی کوہِ غم کو توڑ دو
رگِ جاں کو اِس سے جوڑ دو
تمہیں کچھ سنائی دیں گی
تمہیں کچھ دِکھائی دیں گی

مرے دل کی دھڑکنیں بھی
مرے زخم کی تہیں بھی
مرا ایک ایک ذرہ نئی روشنی کا جویا

نیا عکس آئینوں کا

یہ جہانِ بیکراں کیا، یہ اسیم آسماں کیا
سبھی بس گئے ہیں مجھ میں
سبھی گھل گئے ہیں مجھ میں

مجھے چیر دو
چاہتے ہو جو خلوص و آگہی کی
نئی آگ کا اُجالا
نئی سمت کا اِشارہ
مَیں قدم قدم سویرا مَیں قدم قدم اُجالا
مری زندگی اُجالا مری زندگی سویرا
مَیں سفر کو منزلوں پر دُوں ہمیشہ ہی تفوّق
مَیں گھروں کو
راستوں کے نئے حُسن سے مِلاؤں
مرے باغ کی بہاریں مری فکر کی ہوائیں
مری نکہتوں کے موسم
مری روشنی کے دھارے
مرے رُخ بدلتے دریا
مرے جاں نواز صحرا
مرے عزم کی بلندی، مری وادیوں کی سُرخی

نئی معرفت کی خوشبو

مرے چشمۂ صفا کا نیا شیشۂ تن تموّج
کبھی سبزہ سبزہ بکھرا کبھی زردیوں میں اُلجھا
مری لہر ہیں رواں ہیں نئی کشتیوں کے ساحل
مری موج سے اُلجھ کر ہیں پریشاں ماہِ کامل
کوئی دیدہ ور ہی جانے
کہ سفر کی بے خودی میں
کہاں چھُٹ گئے ہیں سائے
مری دوڑتی زمیں پر
ہوا کیوں مکاں بنائے

مری لہر لہر میں ہیں
نئے خواب یاہنوں کے
نئے گیت باغیوں کے
نئے رمز پاگلوں کے
کوئی حق شناس آئے
کوئی رُوشناس آئے
کوئی تہہ شناس آئے
یہ سکوت ساحلوں کا
یہ جمود پتھروں کا

یہ حصارِ ریگِ تن کا

مجھے کس طرح پڑھے گا مجھے کس طرح سُنے گا

مرے دُکھ یہ کیا کہے گا

کوئی جھیل ہیں جو ہوتا

یہاں ہنس جگمگاتے

کوئی سایہ ہیں جو ہوتا

یہاں راستے، ٹھہرتے

ہیں شجر جو کوئی ہوتا

تو پرندے چہچہاتے

کوئی ساز ہیں جو ہوتا

تو مُغنی آتے جاتے

ہیں پہاڑی ایک جھرنا جسے آس بستیوں کی

نہ ہراس موسموں کا

رواں اپنی دُھن میں ہر دم

جواں اپنی دُھن میں ہر دم

مرے زخم کے کنول تک

کوئی سنگ کیسے پہنچے

مرا زخم زخم سایہ

کیا اُسکوں دے راستوں کو

مرے شعور کی فضا میں
کیا پرندے جو چہچہائیں
مری لہر کی دھنوں پہ
کیا مغنی گیت گائے
مرے کوہِ غم سے رشتہ
نہیں جس کی خلوتوں کا
مرے چشمۂ صفا میں
نہیں عکس جس کے تن کا
جو ترانہ پڑھ رہا ہے
فقط اپنی جلوتوں کا
وہ سراغ کیسے پائے مری روشنی کے بن کا
وہ اندھیرا میں اُجالا
وہ ہے رات میں سویرا
وہ اسیر اپنے غم کا، میں وزیرِ شہرِ تم کا
وہ سفر سفر اُداسی، میں سفر سفر گلابی
وہ شجر سے ٹوٹا پتّہ، میں زمیں کا گہرا رشتہ
وہ الگ ہے میں الگ ہوں
مجھے اُس سے کیا شکایت وہ سیاہ ایک آیت
کوئی اور ہے جو ہر پل مرے ساتھ جی رہا ہے

مرا خون پی رہا ہے، مری ہڈیوں میں بس کر
مرے ہونٹ سی رہا ہے

اوقات

سب کی تحقیر کرتا رہتا ہے
نہ خدا ہی کا پاس ہے تجھ کو
نہ کسی آدمی کا کوئی لحاظ
پیکرِ خاک ہے اگر تو بھی
کچھ تو رکھ اپنی ذات کا احساس
آگ شرمندہ، خاک شرمندہ
روشنی روشنی سے شرمندہ
کیا بتاؤں تجھے تری اوقات

شیشہ

گُلاب تن ہُوں

مزاج میرا نسیم سا ہے
قیام کرتا ہوں نرم شاخوں کے جُھرمٹوں میں
ہَوا کا ادنیٰ سا تیز جھونکا
رگِ گلُو پر دہ تیغ مجھ کو
مَیں قطرہ قطرہ لہُو کی صُورت
ٹپک پڑوں ارضِ بے کسی پر

یہ گرد مجھ کو چٹان سی ہے
جو دب گیا میں
نہ چیخ پاؤں، نہ کہہ سکوں کچھ
تو سنگ بارش میں کیا جیوں گا
گلاب ہونٹوں سے گفتگو کر
مری سماعت بھی گل کے جیسی
جو لفظ میں سختیاں رہیں گی
چیخ اُٹھے گا شعور میرا
مَیں جلتی شمعوں کی رہ گذر ہوں
لوؤں سے نازک سفر کا رشتہ
پڑے جو سایہ بھی ظلمتوں کا
مرے بدن پر خراش آئے
تو اپنے پیکر کو سنگ کر کے
مرے مقابل پہ آگیا کیوں
یہ راستہ وہ نہیں ہے پیارے کہ جس میں سنگِ غرور تیرا
کچل کے شیشوں کو داد پائے

نسلِ نَو میں چراغ ہوں تیرا

میرے ہونٹوں پہ بھی
ہریالی ہے
عہدِ نو کی
ہاں مگر
سینے میں دہکے ہوئے انگارے ہیں
ایسے دیکھو تو
شگفتہ ہے بہت ہی چہرہ

خوں سے وابستہ وہی

رات کے شہ پارے ہیں
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں اگر اُترو گے

پھر وہی اشک
وہی جھیل کے گہوارے ہیں
مصلحت اور سیاست کی کمیں گاہوں کا
روحِ انساں کو کچلتا ہوا غمناک دھواں

میری
ہنستی ہوئی راہوں میں بھی
بھر جاتا ہے

میں
جلا کر مگر اپنے ہی لہو کی مشعل
"سرحدِ مرگِ مسلسل سے گزر جاتا ہوں"
عہدِ ماضی کا
کوئی مرثیہ میرے حق میں
زندگی بخش اگر ہوتا
تو میں بھی رستو!
اپنا آغازِ سفر کرتا اُسی کے بل پر
فرق اشکوں کا، لہو کا تھا

مرے پیشِ نظر
سارے اندھیارے پسِ پُشت رکھے
اک دیا
پھر سر دہلیز جلایا میں نے
تاکہ
آتی ہوئی نسلوں کے
ہلالی جذبے
آفتابوں کی تمازت کو بھرے سپنوں میں
اپنی اُس منزلِ مقصود کو پا لیں
جس میں
غنچۂ نَو کو بدلنا ہے مکمّل گُل میں
اور ہر پھول کو
اپنانی ہے اک ایسی روِش
جس میں کانٹوں کے غم و درد کا سُونا رستہ
جگمگاتے ہُوئے
اُس شہر کا نقشہ بن جائے
مدّتوں
جس کا نگاہِ انساں
خواب

بُنتی رہی تنہائی میں
مُردہ تہذیب کے خوش رنگ
شگفتہ جذبو
اپنی تہذیبی روایت کو مٹا کر
تم نے
اپنے دامن میں
ملامت کے سوا کیا پایا
عہدِ عُریاں میں
ندامت کے سوا کیا پایا
نکہتِ کوئے ہوس
بڑھ کے گلی کوچوں کو
اپنے دامن کی
ہواؤں میں اُڑا کر لے جائے
زرد پتّوں کے
غم و درد سے عاری ہے اگر
سُوکھتے پیڑ کی
جلتی ہُوئی عُریانی کا
وہ
لباسِ غم صد رنگ نہیں بن سکتی

جس میں
رُوحوں کا وہ مطلوبِ سُکوں
سبز پتّوں کے لبِ سُرخ سے
ایسا پھُوٹے

چاند
جیسے کسی ہریالی میں سونا بھر دے
آس کو یاس کی بے نُور قبائیں دے کر

وقت
اک تیز رَو آندھی سا گزر جائے گا

آنکھ
اُس غنچۂ نورس پہ کہاں تک روئے

وہ
جو اِس صُبح کی آغوش میں مر جائے گا

آزاد غزلیں

سو گیا چاند، آؤ سو جائیں
رات کی دھڑکنیں جگائیں گی خواب کی وادیوں میں کھو جائیں

درد کی فصل کاٹنی ہے ہمیں
ان سلگتی ہوئی زمینوں میں کچھ تو اشکوں کے بیج بو جائیں

موج بننا نصیب میں کس کے سب کے حصّے میں اضطراب کہاں
اونگھتے ساحلوں کو رو جائیں

بحر سے موتیوں کی آس فضول
آنسوؤں کے گھنے سمندر میں اپنی ہی ذات کو ڈبو جائیں

درد مطلوب ہے کسی بھی طرح
وہ اگر پھول دے نہیں سکتے کوئی کانٹا ہمیں چبھو جائیں

کتنے دریا قریب سے گزرے دل کے داغوں کا ہے وہی عالم
بات تو جب ہے داغ دھو جائیں

ساری دنیا منافقت خوگر کون اب کس کو پوچھتا ہے یہاں
آؤ ہم تم تو ایک ہو جائیں

دل اداسی کا بن گیا مرکز ٹھنڈکیں ہم کو مار ڈالیں گی
آپ کو مان لیں گے ہم محسن چند شعلے اگر سمو جائیں

بحر تو بحر ناخداؤں کا اب بھروسہ نہیں مسافر کو
جانے کب کشتیاں ڈبو جائیں

ہرے سفر میں لالہ فام ڈگر کوئی
یا دل تن کے ویرانے میں بسے ہمکتا گھر کوئی

لفظوں کی ویرانی کیسے بھائے نظر کو
معنیٰ کے ساغر چھلکاتا آئے دل کی پیاس بجھانے اک آباد نگر کوئی

اندھا رستہ کیا جانے گا شیشہ مزاجی عکسوں کی
دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو ہنستا رہے گا مار کے بے حس پتھر کوئی

بستی کی محدود فضا کیا راحت دے گی
قدموں کی وحشت بڑھتی ہے رکھ آزاد سفر کوئی

اپنی فقیری کی عظمت سمجھاتے اس کو
اپنے غرور و ناز کو تج کے ملتا شہزادِ نظر کوئی

عُریانی کا ماتم سب کو
زرد سفر میں سر کو دیتا رنگ برنگی چادر کوئی

اپنے گھر سے باہر نکلو قدم قدم پر مل جائے گا
آپ کو روشن رہبر کوئی

کوئے ہوس کی سرد ہوا ہے جذبوں کو بھی سرد کرے گی، سانس رُکے گی
برف فضا میں آگ لگاتا شہپر کوئی

تاریکی میں بسنے والے جگنو پر تنقید کریں گے، رات ہنسے گی
سورج میرے قبضے میں ہو، ایسا دکھا اب منظر کوئی

نسیمِ جانفزا بن کر مہکتی صبح کے ہاتھوں بکھرتے رنج تنہائی کو خوئے انجمن دیدو
جھلستی زندگانی کو گلوں کا پیرہن دیدو

ہمارے شور سے آگے بہت ہے شہرِ خاموشی کھلا یہ بھید اب ہم پر
ہمیں بھی اپنا اندازِ سخن دیدو

اُنہیں احساس تو ہو خوگرانِ رنج و محنت کا کہ کیسے جی رہے ہیں وہ
سکونِ لبریز تلوؤں کو بھی کانٹوں کی چبھن دیدو

فضا کتنی کشادہ ہے، ہوا کی ہمدمی کیا ہے، بساطِ آسماں کی حیثیت کیا ہے سرِ حسرت
برائے آزمائش آسماں پروازیوں کو جلتے سپنوں کی گھٹن دیدو

یہ سورنگ و نور کے ڈیرے اُجڑ جاتے ہیں پل بھر میں نہ پھر بادل نہ وہ شادابیوں کی بھیگی غمخواری
جو بس میں ہے ہمیں آسائشِ رنج و محن دیدو

یہ تاریکی مٹادے گی ہر اک نقشِ وفا اک دن بھری آبادیاں اپنی بدل جائیں گی جنگل میں
تبھی شمعوں کو آندھی میں سُلگنے کی ادا دیدو

امیرِ شہر کی اُس کج کُلاہی سے نمٹنا ہے، بہت نازاں ہے وہ خود پر
حقارت چوٹ لگتی ہے فقیرِ بے نوا کو آج اپنا بانکپن دیدو

رہائشِ بوڑھے پیڑوں کی اُسے بوڑھا بنادیگی، یقیں کی آنکھ کہتی ہے
اگر ہے غنچۂ تازہ اُسے تازہ بدن دیدو

ابھی زندہ ہے کیسے خاک کی نسبت سے لوٹے گا اُسے تو رنگ و بو اپنے لٹانے ہیں
جو مر جائے تو جھوٹے اشک پلکوں پر سجا کر چین سے سچا کفن دیدو

خُدا کرے یہ سِلسلہ بڑھے کبھی کلام تک، محبّتوں کے جام تک
ابھی تعلّقات ہیں فقط دُعا سلام تک

اُڑی جو دھول رہگذار گُل میں آنکھ نم ہُوئی، نظر سے بارشیں گریں
یہ سِلسلہ پہنچتا کاش درد کے پیام تک

طلب کِسے ہے قافلے کی جستجُوئے ذات میں، سفر کی بازگشت تک
مُسافرِ حیات ایک منزلِ دوام تک

نصیب قُرب ہو تو کیوں؟
ہزار فاصلے بھی ہیں محبّتوں کے باب میں مقام سے مقام تک

وہ خاص گفتگو کہ جس میں دل کو دل سے راہ تھی سُپردِ غیر کیا کروں
اگر پہنچ گیا ہے وہ بھی شاہراہِ عام تک

وہ اپنے دل کی آگ لیکے آسمانِ ذات سے گزر گیا، روشِ روشِ بکھر گیا
یہ ہم کہ چاندنی سے کھیلتے رہے ہیں بام تک

ہوا ہی سازگار جب نہ ہو، تو کیا بڑھیں قدم، ہزار اپنا ہے چمن
ہمارا حال جانے کیا، ہو نکہتِ پیام تک

قدم قدم پہ بے دلی، قدم قدم پہ ماندگی، قدم قدم یہ بے رُخی خود اپنے ہی وجود سے
مٹے نہ اُس کا اپنا سا نقشِ حجتِ تمام تک

تمام لوگ اپنے اپنے قافلوں میں بٹ گئے، گُلوں کے سنگ، رنگ میں
مَیں اپنے خوں میں ڈوب کر گیا سلگتی شام تک

سُلگتی شاخوں کی دسترس میں گُلاب اندر گُلاب رکھنا
ہزار صحرا بچھیں قدم میں تو اپنے دلدادگاں کے حق میں محبّتوں کے عذاب رکھنا

یہ دل کی بازی تو جیت لیں ہم اِسی سے وابستہ زندگی ہے ، رہے جو زندہ
ہمارے آگے بھی نقدِ شہرِ ثواب رکھنا

ہم اپنا چہرہ ہی پڑھ نہ پائے تمہارا چہرہ پڑھیں گے کیسے ، بصارتوں پر عذاب ہوگا
قریب آکر حجاب رکھنا

مَیں کالی راتوں کے کالے فقرے گوارا کب تک کروں سفر میں ، جو چاند ہو تم
رُخِ حسیں بے نقاب رکھنا

ابھی تو آنکھیں حقیقتوں کے لہو سفر سے گزر رہی ہیں ، قدم قدم امتحاں بچھا ہے
سکوں کہاں ہے ، جو نیند گھیرے ہماری پلکوں پہ خواب رکھنا

زمیں کے سینے کی آگ مجھ کو تباہ کرنے پہ تُل گئی ہے ، مجھے ہے بلنا مگر اُسی پر
یہ آگ جب تک نہ سرد پا ہو ، سحاب اُوپر سحاب رکھنا

ہجُوم بہری سماعتوں کا ، عذاب دیوار بن گیا ہے ، نظر کے حق میں
گراں ہے رُوشن خطاب رکھنا

جہاں نہ ہو آدمی کی قیمت ، بیاں کی عظمت چلے گی کیسے ؟
فضول ہو گا کتاب رکھنا

نہ شاخ اُجڑے ، نہ پھُول جھُلسیں ، نہ شہرِ شبنم دھواں دھواں ہو ، سرِ چمن اب
تمُ ایسا کوئی نصاب رکھنا

روتے ہیں نہ ہنستے ہیں، چلتے ہیں نہ رُکتے ہیں، یہ کون سے رستے ہیں؟
منزل کو ترستے ہیں، یا خود ہی سے رُوٹھے ہیں

خوش فہم سپیروں سے موسیٰ کوئی ٹکراتا، جادُو ہوا ہو جاتا، سب شہر بکھر جاتا
سانپوں نے عصا تیرے پرتو کہاں دیکھے ہیں

کرنوں کی ہری فصلیں ہیں شام کی چوکھٹ تک بجھتے ہوئے سورج کو یہ زخم بتائیں کیا
ہم رات کی آندھی میں کرنوں سے بچھڑتے ہیں

کیوں چاند نہیں ہنستا، مجلس میں ستاروں کی کیا رونقِ دل، یہ بھی آسیب کے سائے ہیں
اُجڑے ہوئے آنگن ہیں بے نُور دریچے ہیں

بھڑکے ہوئے شعلوں کو یہ درس کوئی دیدے ہر پیاس کی میزان پر دریا نہیں تُل جاتے
اک بوند ہی پی لیں وہ، دریا یہاں ٹھہرے ہیں

راتوں کی چمک ہی سے حیران ہوئیں آنکھیں، تابندہ سحر تک ہم لے جائیں اُنہیں کیسے
کیا جانیں حقیقت کو جو خواب سے سہمے ہیں

شبنم کو کہو شعلہ، شعلے کو کہو شبنم، پتھّر کو کہو گُل ہے، گُل ہے تو کہو پتھّر
اس عصرِ فسوں گر کے نقشے سبھی اُلٹے ہیں

اک گھاس کی پتّی بھی رکھتی ہے انا سر میں، کب اس سے ہواؤں کا جھونکا کوئی دبتا ہے
کیا پیڑ نے آندھی کے تیور نہیں دیکھے ہیں؟

زاہد کی غزل سُن کر تحریک ملی مجھ کو کچھ شعر کہوں میں بھی بگڑے ہوئے تیور کے
نقشے مری فکرِ دل کے اُس شخص سے ملتے ہیں

نوٹ:۔ زاہد سے مُراد محبی صابر زاہد جاگالوی ہے

بھروسہ تیری ہستی پر کیا ہے
ہمیں فکرِ سفر کب تھی سفر میں، جہاں بھی واسطہ غم سے پڑا ہے

کہاں جائیں گے اب آرام کرنے
ہمارے گاؤں میں اک پیڑ تھا جو، ہمارے اندھے ہاتھوں سے کٹا ہے

ہمارے پاس بھی کچھ دیر بیٹھو، تمہاری شخصیت ہم بھی تو سمجھیں
تمہارا تذکرہ سب سے سُنا ہے

لہُو وہ آب دے پھر بازوؤں کو کہ پتوار بن بدل شمشیر کا ہوں
سمندر آزمانے پر تُلا ہے

تمہارا فرض کیا ہے یہ بھی سوچو تعلّق ہے اگر ایمان سے کچھ
کسی نے جب بھروسہ کر لیا ہے

اُسی اک آخری تارے سے، ہم کو کوئی اُمید تھی اپنی سحر کی
کیسے دیکھیں کہ وہ بھی ڈوبتا ہے

بڑھو اپنی ہی اُونچائی کی جانب جو سائے چیختے ہیں۔ چیخنے دو
جہاں سورج چڑھا سایہ گھٹا ہے

رکھے کوئی بھی ہنستے گُل سے رشتہ، بغاوت پر اُتر آتے ہیں کانٹے
سبھی کو زخم کا تحفہ ملا ہے

اک ایسی آگ بن جاتا ہے خود میں لگے زنجیر بھی شہپر سی اُسکو
وہ جس کا درد سے رشتہ جُڑا ہے

اُجڑتی بارشوں میں کیا، کسی گُل پر نکھار آئے ترے رہرو سُلگتی دھوپ کا موسم گزار آئے
اُنھیں کیسے قرار آئے

یہ موسم کا نہیں زرخیز مٹّی کا کرشمہ ہے، شجر کی نرم شاخوں پر
بہار آنے سے پہلے ہی بہار آئے

بھٹکتی رہگذاروں کو یقیں آتا نہیں اِس کا کہ اپنی کوئی منزل ہے
برائے رہنمائی کوئی اندھا اعتبار آئے

کرن کی رہنمائی میں بنائے اپنا گھر شبنم، ہمیں رنجش نہیں کوئی
گُلوں کی راہ میں کیوں خیمۂ برق و شرار آئے

ہمیں اشکوں کی ویرانی میں کوئی رنگ بھرنا تھا لہو میں ڈوب کر اپنے
پرانا بوجھ تھا سر پر اُسے بھی ہم اُتار آئے

اسی رستے پہ ہم نے بھوک کے دن بھی گزارے ہیں، پڑھا ہے بھوک کی مجبوریوں کا ہر ورق رو کر
چھلکتے خالی کاسوں پر ہمیں کیونکر نہ پیار آئے

انہیں بھی اپنے اندر کا ہر اک بُت توڑنا ہو گا یہی اک آخری رستہ ہے قربت کے بڑھانے کا
اگر وہ چاہتے ہیں ہم میں طرزِ انکسار آئے

وہی آنکھیں، وہی برسات کا موسم وہی ہم ہیں، نہیں ہے فرق کچھ ایسا
کبھی شکلیں بدل کر راستے میں غمگسار آئے

اسی تپتے ہوئے صحرا میں اپنی عمر گزری ہے، مسافت کے نشاں ریگِ رواں پہ ثبت ہیں اب تک
کبھی تو کسمپرسی کو سمجھنے لالہ زار آئے

آشفتہ سر تمہارے، شہرِ نظر سے گذرے
شیشہ بدن تھے لیکن، سنگِ سفر سے گزرے، خوشبوئے تر سے گزرے، کانٹوں کے ڈر سے گزرے

آہٹ نہ کوئی سایہ، بستی نہ کوئی صحرا، ہم اپنی جُستجو میں
ایسے بھی گھر سے گزرے

بکھراؤ اِس قدر تھا، اپنے شکستہ دل میں منزل بھی گُم ہوئی تھی
نظمِ سفر سے گزرے

شوریدگیٔ دریا کیا چاہتی ہے ساحل اِسکی تجھے خبر ہے
ہر لہر کی یہ خواہش موتی کے گھر سے گزرے

کوئی نہیں جو بڑھ کر کاسوں کا پیٹ بھر دے، ہر تشنگی بُجھا دے
کتنے ہی نامی حاتم بھُوکے نگر سے گزرے

شب سے اُلجھ اُلجھ کر پینائیاں بُجھیں جب، تب ہوش آیا ہم کو
اَندھے سفر سے گزرے

یہ آنگنوں کے والی، یہ سانکوں کے سائل کیا جانیں خوں کی عظمت
اپنا وقار کھو کر، ہر سنگِ در سے گزرے

آنکھوں میں بس گئی تھی رنگوں بھری چمک اک، جادہ اُٹھائے سر پر
ہر بحر و بر سے گزرے

ہم لہر لیتے خوں کی
طشتِ گہر سے گزرے، بپھرے بھنور سے گزرے

پیاسے دریا مرے ساتھ چل، دشت، صحرا، سمندر، نہیں تیرے گھر
کچھ مداوا اگر ہے تری پیاس کا، میرا خونِ جگر

سنگ کی جستجو ہے تجھے یہ تو گلزار ہے، تیشہ بیکار ہے
تیرے کس کام کا کوئی شیشے کا گھر

عام رستوں سے مانوس سب،
منزلیں آفریں کہہ اٹھیں ڈھونڈ لے ایسی کوئی رہگذر

قطرہ قطرہ ٹپک دیدۂ خواب سے
قیمتی گوہرِ چشمِ تر

منزلِ سنگ ہے، وحشتوں کے سوا کوئی چارہ نہیں
ٹوٹ جائیں گے شیشے کے پر

مُجھ کو ٹھُکرانے والے مرے ساتھ چلنے پہ مجبُور ہو جائیں گے
اُن پہ کھُل جائے گا میرا عزمِ سفر

اُس کی اپنی نظر میں وہ فنکار ہے، جس کو اِنکار ہے
وہ سراپا ہُنر اور مَیں بے ہُنر

مصلحت تھی کوئی جس سے مَیں چُپ رہا
اپنی دانست میں وہ سمجھتا رہا اُس نے ہی دیکھے ہیں بحر و بَر

اک شجر راستے میں مِلے گا تمہیں، جس نے دیکھے ہیں موسم سبھی
بے جھجک پُوچھنا کب جلیں گے شجر

اک برگِ زرد منظر، آتش بجاں چلا ہے
جب بھی کوئی اِشارہ، صحرائے زندگی کو جنّت نشاں بنانے تم نے کبھی کیا ہے

رستے کی وحشتوں سے سہما ہے ہر مسافر، منزل تری بشارت کیا دے کوئی سفر میں
کب دوڑتی ہوا سے بُجھتا دِیا جلا ہے

مَیں سنگِ رہگزر ہُوں، وہ شیشۂ تنِ سُبک رَو، ہمزاد کوئی آئے کُچھ فاصلہ مِٹے گا
بڑھتا ہوا تغیّر دونوں کے درمیاں ہے، سنگین حادثہ ہے

دھاگے سے اپنے ٹوٹی اُڑتی پتنگ تیرا
اب آسرا ہُوا ہے

تنہائیوں کا جنگل، مونس نہ کوئی ساتھی، بڑھ کر بھی کیا کرُوں گا
گھیرے ہُوئے خلا ہے

کیسے نظر مِلاؤں، شرمندۂ نظر ہوں
تو بدگماں ہے مجھ سے ہمراز زندگی کے، یہ رنج کھا رہا ہے

آشفتگانِ غم ہیں، دے کوئی سُرخ پتّی ہنستے ہوئے شجر کی
یہ گردِ گردِ منظر آنسو رُلا رہا ہے

پھر سنگ زاد آئے بھر کر شرار دل میں بھولی ہوئی ڈگر پہ
شیشوں کو جوڑنا ہے

آوارگی نہیں تو پھر کیا ہے غمزدہ دِل،
ہم نے دماغ ہو کر، خود اپنی منزلوں کو شہرِ جنوں سے ہٹ کر رُسوا بہت کیا ہے

رستے میں غم بکھرا ہُوا
جاؤں کدھر اے ہمسفر، ہر راستہ ٹھہرا ہُوا، سمٹا ہُوا

نُقطوں کی وُسعت دیکھکر خائف ہُوئے ہیں دائرے
نُقطہ بہت پھیلا ہُوا

محدُود اُس کی گفتگو تھی خود ہی زنگِ لفظ سے، کیا عکس کو دیتی جلا
آئینہ بھی رُسوا ہُوا

پھر شہر کی خوش رنگیاں جنگل کی جانب بڑھ گئیں، آزاد وُسعت کیلئے
طاؤسِ رنگ و نُور کو دیکھا تو اندازہ ہُوا

ہو تیز جو لمحوں کی رَو، پھٹتے ہیں جسم و جاں مرے، اندھی ہوا
سینے میں ہے جیسے مرے اک زلزلہ ٹھہرا ہُوا

جب زخم پر چرچا ہُوا میرا مخاطب وہ نہ تھا، دُنیا کھڑی تھی سامنے
چہرہ مگر اُس کا مِلا اُترا ہُوا

خوں میں حرارت ہے اگر بنتی ہے نیزہ ہر کرن، پتّھر بچھاتی راہ میں
خورشید جب گھر سے چلا بادل بھی تھا چھایا ہُوا

کِس پھول کا حُسنِ نظر مائل ہُوا الطاف پر، ٹھُکرا کے سیم و زر کی سیج
مٹّی کی دیواروں کا گھر دیکھا گیا سجتا ہُوا

شاید لبِ گفتار نے سچ بات کہدی تھی کوئی
ہر شخص تھا رُوٹھا ہُوا

آنکھوں میں رنگ و نُور کے دریا لئے ہُوئے

اے پل صراطِ شوق نئی سمت کے لئے گزُرے ہیں ہم بھی سب کے مکاں جھانکتے ہُوئے

احساں زبان و لب کا نہیں لیتی اب زباں ، اظہار نے وہ طرزِ بیاں ڈھونڈ لی یہاں

سب ہونٹ آج تم کو مِلیں گے سِلے ہُوئے

اِس روشنی نے اور بھی بھٹکا دیا ہمیں

جلتے چراغ تھوڑی سی مہلت تو کر عطا ، مُدّت ہُوئی دِلوں کے دھوئیں سے مِلے ہُوئے

تجدید چاہتی ہیں پُرانی روایتیں ، تازہ ورق پہ تازہ لہُو کے نشان ہوں

اُترے کوئی کتاب میں نیزہ لئے ہُوئے

رکھ تازہ پنکھڑی پہ کوئی اجنبی کرن

شبنم زمانہ بیت گیا تجھ کو ہوش ہے اشکوں کے رنگ میں کوئی نغمہ سُنے ہُوئے

اب بھی ہیں اپنی ریت کی کچھ پتیاں ہری، حالانکہ تپتی دھوپ میں مہ و سال ہو گئے
سیلابِ غم کو جسم سے لپٹے ہوئے ہوئے

زندوں کو ایک پھول کسی نے نہیں دیا
یہ زندگی کا طرفہ تماشا نہیں تو کیا، دیکھے ہیں میں نے راہ میں مُردے سجے ہوئے

اُن میں بھی کوئی عکس اُترتا حیات کا، وہ روشنی کی باڑھ تھی موسم تھا ابر کا
اے کاش ہوتے سنگ کے سینے کھلے ہوئے

کانٹوں کا خالی کاسہ بھی بھرتا ہے پھول سے
دستِ دُعا گواہ کہ ہیں آج بھی وہ سر، جو اُڑتی دُھول رنگِ چمن ہے لئے ہوئے

کرن کرن ہیں لہو کے چھینٹے، کلی کلی بدحواسیاں ہیں، خوشی کہاں ہے
ہر ایک لمحہ عذابِ جاں ہے

تُو سامنے ہو تو کچھ کہوں میں ہنئے سفینوں کی سرگرانی، تمام عالم ہے گُونگا بہرا
سماعتوں کا جہاں کہاں ہے

مَیں دھُوپ اپنے کھُلے پروں میں سمیٹوں کیسے کہ تنگِ جاں ہُوں
جو میرا سایہ ہی بے اماں ہے

مُجھے ضرورت ہے روشنی کی
وہاں وہاں میرا غم گیا ہے، اُجالا تیرا جہاں جہاں ہے

محبّتوں سا بھٹک رہے ہیں، نہ اِس کنارے نہ اُس کنارے ہمارا ساحل
مکاں ہے اپنا نہ لامکاں ہے

کبھی شجر کا بس ایک پتّہ نظر میں دیوار بن گیا ہے، کبھی کرن آگئی ہے تن تک
ڈگر ہے تیری عجب تماشہ، کہیں عیاں ہے کہیں نہاں ہے

میں اپنے تن کی ہر ایک آہٹ کو سُن رہا ہُوں رہِ خموشی
عجب سماں ہے

جہاں ستاروں کے سر جھکے ہیں نگار خانہ ہے میرے غم کا
بس ایک تُو ہے کہ بدگماں ہے

وہاں تلک میرے نقشِ پا ہیں، مشاہدہ کر، نظر اگر ہے
جہاں تلک تیرا سائباں ہے

کہے کون، اس کو، بہار ہے

نہ وہ تن پہ پھولوں کی چادریں، نہ وہ رنگ و بُو کا دیار ہے

کہیں اور چل مرے ہم زباں، یہاں حق پرستی کا ذکر کیا، یہاں بات کرنا بھی جُرم ہے

جہاں لب کھلیں وہیں دار ہے

یہ وہی گلی ہے وہی مکاں، وہی بام و دَر، جہاں بھیڑ رہتی تھی رات دن

وہ مہک ہے اب نہ وہ روشنی، مری حسرتوں کا مزار ہے

یہ تصرفات کی چاندنی، یہ نمائشیں مہ و مہر کی، مری منزلیں تو کہاں رہیں

مری منزلوں کا غبار ہے

کوئی توڑ دے یہ حصارِ غم کہ سبھی کا جینا حرام ہے، سبھی ہاتھ زخموں سے چُور ہیں

بڑا جان لیوا حصار ہے

ترے شہر میں سبھی علم داں، سبھی قیس و غالب و میر ہیں، سبھی سلطنت کے وزیر ہیں
کہاں اُن میں میرا شمار ہے

جہاں جائیے یہی مرحلے، یہی پیچ و خم غمِ زیست کے، یہی فرقِ پست و بلند کا
کِسے زندگی میں قرار ہے

نہ کریں غموں کی شکایتیں، نہ سُنیں الم کی حکایتیں، جئیں شان سے مریں شان سے
کہ اِسی میں سب کا وقار ہے

اُسے امتحاں میں نہ ڈالیے اُسے اپنے حال پہ چھوڑیئے، یہاں حوصلوں کی ہے گفتگو
وہاں حوصلہ ہی نزار ہے

دلوں کے ترجمان ہیں
تمہارے قافلوں نے جن کو گرد کہہ کے راہ سے ہٹا دیا وہی غموں کی جان ہیں

ہوائیں دے کے ان کو خاک و خوں میں کیوں ملائیے
شرارِ بے زبان ہیں

پگھلتی رہگذر پہ اپنے نقش کیا بنائیں گے
بکھرتے سرد قافلوں کے ہم لہو اُگلتی راہ میں دہکتے پاسبان ہیں

سُبھاؤ، رکھ رکھاؤ، لفظ گفتگو میں آ گئے
خطا معاف کیجئے تمام لوگ کہہ رہے ہیں آپ تو مہان ہیں

زمیں کے جیتھڑے ہوئے زمین کانپ اُٹھی
نہ اشک آنکھ سے گرے، نہ لفظ ہمنوا بنے، نہ ہاتھ زخم سے ملے، کہاں کے آسمان ہیں

زمیں کا سینہ کاٹ کر اُگا رہے ہیں فصل کو
چمکتی اِن حویلیوں کے درمیان بھوک پیاس کے امین، دل جلے کِسان ہیں

کوئی شجر، کوئی ہوا، ہمیں نہ روک پائے گی
سُلگ گئے کہسار، اپنی آنچ ہم سے دُور رکھ، ابھی ہمارے حوصلے ہمارے غم جوان ہیں

ہمارے نقش، سنگ سنگ، ہماری بُو چمن چمن
نشاں مٹانے والے آج خود ہی اپنی ذات میں جو آنکھ ہو تو دیکھئے کہ کتنے بے نشان ہیں

ہوا پَروں میں باندھ لی، شرارِ دل میں بھر لئے
ہمیں خبر ہے، راستے کے سارے موڑ آسماں سمان ہیں

اشکوں کا تبسم ہیں جھرنے، کہسار سمجھنے سے عاجز
کیوں آنکھ کے دریا بہتے ہیں، کیوں سخت چٹانیں کٹتی ہیں غمخوار سمجھنے سے عاجز

اِن ابر کے اُڑتے ٹکڑوں سے کیا بہتی ہوائیں کہتی ہیں، ہم پیڑ سے اُلجھے بیٹھے ہیں
اِنکار سمجھنے سے عاجز، اقرار سمجھنے سے عاجز

اِس رنگ بدلتی دُنیا میں تُو اپنی صدا کا دیوانہ کیا طرزِ سُخن کو سمجھے گا
اِظہار کی پردہ داری کو اظہار سمجھنے سے عاجز

سُورج کے دمکتے رستے پر تُو جگنو لیکر نکلا ہے، اک مَیں ہی نہیں حیران یہاں
معصُوم فرشتے تیری ادا، انوار سمجھنے سے عاجز

ہیرا ہے کہ پتھر تیرا فن، شعلہ ہے کہ خوشبو کون کہے
بازار سمجھنے سے عاجز

پھولوں کی مسافت طے نہ ہوئی، کیوں زہر اُگلتے ہیں موسم
اشجار، سمجھنے سے عاجز

کیوں لفظ و بیاں کی منزل میں سر اپنا اُٹھائے چلتا ہوں، معنیٰ کا عَلَم ہاتھوں میں لیے
وہ جہل کا مارا، فن دشمن، پندار، سمجھنے سے عاجز

کیوں جھوٹ کے چہرے ہیں روشن، کیوں قتلِ صداقت عام ہوا، کیوں بجھنے لگی ہے شمعِ وفا
سب جلتے بجھتے رستوں کے اسرار، سمجھنے سے عاجز

سائے کی طرح گھر میں آئے، وہ مثلِ صبا چپ چاپ چلے چپ چاپ رُکے
کیا اپنے پڑوسی کا غم ہے، دیوار سمجھنے سے عاجز

مرے در تک چلا آیا
پئے تعظیم اُٹھ، دشتِ غریبی، ایسی حالت میں کہاں جاتا زمانے بھر کا ٹھکرایا

پرندے موتیوں کی ڈال سے چپکے ہوئے سارے، پرانے طور فرسودہ
پھلوں سے اب کوئی نسبت نہ آنکھوں میں شجر سایہ

دُعائیں دے رہے ہیں میرؔ و غالبؔ کی بصیرت کو خزانہ دے گئی ہم کو
متاعِ درد تجھ میں ہم فقیروں نے مزہ پایا

گلوں کا دامنِ صد رنگ بھی تھا اپنی آنکھوں میں
خلش کی آرزو بھی، چن لیا مُرجھائے پھولوں میں صبا، کانٹوں کا سرمایہ

رفیقِ جاں تھا، مَیں اُس سے جُدا ہوتا تو مر جاتا، مرا دل تجھ سے کہتا تھا
زمانے نے بہت اُس کے خلاف آ آ کے بھڑکایا

اَدائے دوستی ہے ؟ انتقامِ ذات ہے ؟ کیا ہے ؟ خدارا کچھ تو سمجھاؤ
مجھے اپنا بنا کر اپنے ہی رستے سے ہٹوایا

کمالِ فقر، شانِ بے نیازی، کیسے سمجھائیں، غلط ہے تربیت اُس کی
وہ شاہی چھت کا پروردہ، وہ سیم و زر کا چمکایا

اَدائے فرض سے غافل نہیں رہتے، اگرچہ دُشمنِ جاں ہے، شریعت جاں سے پیاری ہے
پڑوسی ڈھونڈ لاتے شہر بھر میں ، ہم سا ، ہمسایہ

بُرائی دل میں بیٹھی تھی
وہ مجھ سے دُور جا کر اپنی تنہائی میں پچھتایا

مقیم اثر بیاوی (گوشوارہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات)

مطبوعہ کلام ....

لا تقنطوا	مطبوعہ
نغمۂ سنگ	مطبوعہ
بدن نژاد قبا	مجموعۂ ھذا
شکستِ آواز	آئندہ اشاعت
جرسِ گُل	------//------
رقصِ شرر	------//------
زنجیرِ صبا	------//------
پیرہنِ خاک	------//------
جلوۂ سراب	------//------
برقِ نظر	------//------
تبسّمِ اشک	------//------
غزالِ شوق	------//------
سرودِ شام	------//------
شُعاعِ درد	------//------
طاؤسِ رنگ	------//------
نگارِ دشت	------//------
وحشتِ دَر	------//------

مُقیم اثر بیاوَلی — غیر مطبوعہ تصنیفات

شعورِ غم — آئندہ اشاعت

زخمِ جُنوں ------//------

رمِ غزل ------//------

لمسِ ماورا ------//------

موجِ نے زنجیر (آزاد غزلوں کا مجموعہ) ------//------

لوحِ صحرا ------//------

آسمان بے زمین (برائے غالب) ------//------

تیغِ خود نگر ------//------

آگ لگائیں برف کے پَر (نظمیں) ------//------

خاک خاک موج ------//------

ورق ورق گُلاب ------//------

لہو بھی ایک معجزہ ------//------

شعلہ زارِ حرف ------//------

غمِ آتش خیز ------//------

صدائے شہرِ اجنبی ------//------

قطرۂ بحر کُشا ------//------

طوافِ نُور ------//------

بدن نژاد قبا
مقیم اثر بیاولی